اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد پنجم

مشتمل بر منصب نبوت حصہ عبادات

جس میں پہلے عبادت کا مفہوم بتایا گیا ہے، پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، تقوی، اخلاص،
توکل، صبر، اور شکر وغیرہ جانی ومالی وقلبی عبادات کی تشریح، اور ان کے
احکام ومصالح کی توضیح کی گئی ہے،

تالیف

سید سلیمان ندوی،

باہتمام مسعود علی ندوی

طبع دوم — در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید — ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد پنجم

مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱ - ۶
عمل صالح	۷ - ۱۶
ایمان کے بعد عملِ صالح کی اہمیت،	۷
اعمالِ صالحہ کی قسمیں	۱۶
عبادات	״
اخلاق	״
معاملات	״
عبادات	۱۷ - ۵۸
اسلام اور عبادت	۱۷
اسلامی عبادات کی خصوصیات	۲۰
صرف ایک خدا کی عبادت،	۲۵
خارجی رسوم کا وجود نہیں،	۲۶
درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں،	۲۷
خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں	״
مکان کی قید نہیں،	۲۸
انسانی قربانی کی ممانعت،	۲۹
حیوانی قربانی میں اصلاح،	۳۰
مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت	۳۲
تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہیں،	۳۴
عزلت نشینی اور قطعِ علائق عبادت نہیں،	۴۳
اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم،	۴۵
عباداتِ چارگانہ اعمالِ چارگانہ کا عنوان ہیں،	۵۵
نماز	۵۹ - ۲۰۰
توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم،	۶۸
اسلام میں نماز کا رتبہ،	۷۱
نماز کی حقیقت،	۷۳
نماز کی روحانی غرض وغایت،	۷۷
نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت،	۸۱
ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے	۸۳
نماز متحدہ طریقِ عبادت کا نام ہے،	۸۴
نماز میں نظامِ وحدت کا اصول	۸۵
نماز میں جسمانی حرکات،	۸۶
ارکانِ نماز،	۸۸
قیام،	۸۹
رکوع،	״

مضمون	صفحہ
سجدہ،	۸۹
نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے،	۹۶
نماز کی دعا،	۹۷
اس دعاے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیا کی منصوص دعاؤن سے	۱۰۳
حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا،	۱۰۴
زبور مین حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا،	۱۰۵
انجیل مین نماز کی دعا،	۱۰۶
نماز کے لئے تعینِ اوقات کی ضرورت،	۱۰۸
نماز کے اوقات دوسرے مذہبون مین،	۱۱۰
نماز کے لئے مناسب فطری اوقات،	۱۱۳
اسلامی اوقاتِ نماز مین ایک نکتہ،	۱۱۵
اسلام مین طریق واوقاتِ نماز،	۱۱۷
نمازون کی پابندی ونگرانی،	"
نماز کے اوقات مقرر ہین،	۱۱۸
وہ اوقات کیا ہین،	۱۱۹

مضمون	صفحہ
اوقات کی تکمیل، ۱۲۴ ـ ۱۳۰	
نمازون کے اوقات کی تدریجی تکمیل،	۱۲۴
ایک نکتہ	
جمع بین الصلوٰتین	۱۳۰
اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسرا،	۱۳۲
دلوک کی تحقیق،	۱۳۴
اوقاتِ نماز کا ایک اور راز،	۱۳۸
اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت،	"
اطراف النہار کی تحقیق،	۱۳۹
ایک اور طریقۂ ثبوت،	۱۴۰
نماز پنجگانہ احادیث وسنت مین،	۱۴۱
تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیون؟	۱۴۵
قبلہ،	۱۴۶
رکعتون کی تعداد،	۱۵۸
نماز کے آداب باطنی،	۱۶۲
اقامتِ صلوٰۃ،	"
قنوت،	۱۶۳

مضمون	صفحہ
خشوع،	۱۶۳
تبتل	۱۶۴
تضرع،	۱۶۵
اخلاص،	"
ذکر،	۱۶۶
فہم وتدبر	"
نماز کے اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی فائدے،	۱۷۳
سترپوشی،	"
طہارت،	۱۷۵
صفائی،	۱۷۶
پابندیِ وقت،	۱۷۷
صبح خیزی،	۱۷۸
خدا کا خوف،	۱۷۹
ہشیاری،	"
مسلمان کا امتیازی نشان،	۱۸۰
جنگ کی تصویر،	۱۸۲
دائمی تنبہ اور بیداری،	۱۸۳
الفت ومحبت،	۱۸۴
غمخواری،	"
اجتماعیت	۱۸۵
کامون کا تنوع،	۱۸۶

مضمون	صفحہ
تربیت	۱۸۷
نظمِ جماعت،	۱۸۸
مساوات،	۱۸۹
مرکزی اطاعت،	״
معیارِ فضیلت،	۱۹۰
روزانہ کی مجلس عمومی،	۱۹۱
عرب کی روحانی کایاپلٹ	۱۹۲

زکوٰۃ

۲۰۱ - ۲۸۰

مضمون	صفحہ
زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم،	۲۰۱
زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں،	״
اسلام کی اس راہ میں تکمیل،	۲۰۵
اسلام مین زکوٰۃ کی اہمیت،	۲۰۶
زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل،	۲۰۸
زکوٰۃ کی مدت کی تعیین،	۲۱۵
زکوٰۃ کی مقدار،	۲۱۶
انفاق،	۲۱۷
زکوٰۃ،	״
نکتہ،	۲۱۹
جانوروں پر زکوٰۃ،	۲۲۳
نصابِ مال کی تعیین،	۲۲۵

مضمون	صفحہ
زکوٰۃ کے مصارف اور ان مین اصلاحات،	۲۲۷
دو ضرورتمندون مین ترجیح	۲۳۲
اسلام مین زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ،	۲۳۶
مسکینون، فقیرون، اور معذورون کی امداد،	۲۳۷
غلامی کا انسداد،	۲۳۸
مسافر،	״
جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت،	۲۴۰
زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد، اور اصلاحات،	۲۴۱
تزکیۂ نفس،	״
باہمی اعانت کی عملی تدبیر	۲۴۴
دولتمندی کی بیماریون کا علاج،	۲۴۸
اشتراکیت کا علاج،	۲۵۹
اقتصادی اور تجارتی فائدے	۲۶۲
فقراء کی اصلاح،	۲۶۴
صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے،	۲۶۹

مضمون	صفحہ
صدقہ چھپا کر دیا جائے؟،	۲۷۲
بلند ہمتی اور عالی خیالی،	۲۷۴
فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح،	۲۷۵

روزہ

۲۸۱ - ۳۲۰

مضمون	صفحہ
روزہ کا مفہوم،	۲۸۱
روزہ کی ابتدائی تاریخ،	״
روزہ کی مذہبی تاریخ،	۲۸۳
روزہ کی حقیقت،	۲۸۷
رمضان کی ماہیت،	۲۸۹
فرضیتِ صیام کا مناسب موقعہ ۲ھ،	۲۹۲
ایامِ روزہ کی تحدید،	۲۹۴
ایک نکتہ،	۲۹۸
روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب،	۳۰۰
روزہ مین اصلاحات،	۳۰۱
روزہ کے مقاصد،	۳۰۸
حاملِ قرآن کی پیروی،	۳۰۹
شکریہ،	۳۱۰

مضمون	صفحہ
تقویٰ،	۳۱۱
حج ۳۲۱-۳۹۵	
مکہ،	۳۲۱
بیت اللہ	۳۲۴
حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط،	۳۲۶
ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے،	۳۲۷
اسلام قربانی ہے،	۳۲۹
یہ قربانی کہاں ہوئی،	۳۳۱
مکہ اور کعبہ،	۳۳۳
حج ابراہیمی یادگار ہے،	۳۳۸
حج کی حقیقت،	۳۴۵
حج کی اصلاحات،	۳۴۹
حج کے ارکان،	۳۵۷
احرام،	〃
طواف،	۳۵۸
حجر اسود کا استلام،	〃
صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا،	۳۶۰

مضمون	صفحہ
وقوفِ عرفہ،	۳۶۱
قیامِ مزدلفہ،	۳۶۲
منیٰ کا قیام،	〃
قربانی،	۳۶۳
حلقِ راس،	۳۶۴
رمیِ جمار،	۳۶۵
ان رسوم کی غایت،	۳۶۶
حج کے آداب،	۳۶۸
حج کی مصلحتیں اور حکمتیں،	۳۶۹
مرکزیت،	۳۷۴
رزقِ ثمرات،	۳۸۰
قربانی کی اقتصادی حیثیت،	۳۸۱
ابراہیمی دعا کی مقبولیت،	۳۸۲
تجارت،	〃
روحانیت،	۳۸۴
تاریخیت،	۳۸۶
خالص روحانیت،	۳۸۸
حج مبرور،	〃
جہاد ۳۹۶-۴۱۰	
لفظ جہاد کی تشریح،	۳۹۶

مضمون	صفحہ
جہاد کی قسمیں،	۴۰۰
جہادِ اکبر،	۴۰۲
جہاد بالعلم،	۴۰۳
جہاد بالمال،	۴۰۴
ہر نیک کام جہاد ہے،	۴۰۶
جہاد بالنفس،	۴۰۷
دائمی جہاد،	۴۰۹
عباداتِ قلبی ۴۱۱-۴۹۱	
تقویٰ،	۴۱۲
اخلاص،	〃
توکل،	〃
صبر،	〃
شکر،	〃
تقویٰ ۴۱۲-۴۲۴	
تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے،	۴۱۲
اہلِ تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں،	۴۱۵

مضمون	صفحہ
کامیابی اہلِ تقویٰ کے لئے ہے،	۴۱۶
اہلِ تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں،	۴۱۷
معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں،	"
قبولیتِ اہلِ تقویٰ ہی کو حاصل ہے،	۴۱۸
تقویٰ والے کون ہیں،	"
تقویٰ کی حقیقت کیا ہے،	۴۲۰
اسلام میں برتری کا معیار،	۴۲۲

اخلاص
۴۲۵-۴۳۱

مضمون	صفحہ
اخلاص کا مفہوم اور تشریح،	۴۲۶

توکل
۴۳۲-۴۴۸

مضمون	صفحہ
توکل کے غلط معنی	۴۳۲
توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح،	"

صبر
۴۴۹-۴۷۵

مضمون	صفحہ
صبر کے لغوی معنی،	۴۴۹
وقت مناسب کا انتظار کرنا،	۴۵۱
بے قرار نہ ہونا،	۴۵۳
مشکلات کو خاطر میں نہ لانا،	۴۵۵
درگذر کرنا،	۴۵۷
ثابت قدمی،	۴۵۹
ضبطِ نفس،	۴۶۶
ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا،	۴۶۸
صبر کے فضائل اور انعامات،	۴۷۲
فتحِ مشکلات کی کنجی: صبر اور دعا،	۴۷۴

شکر
۴۷۶-۴۹۱

مضمون	صفحہ
شکر کی تعریف،	۴۷۶
لفظ کفر کی تشریح،	"
شکر اصل ایمان ہے،	۴۷۸
حمد،	۴۷۹
جسمانی نعمتوں کا شکریہ	۴۸۱
مالی نعمتوں کا شکریہ،	۴۸۴
احسان کا شکریہ احسان ہے	۴۸۴

خاتمہ
۴۹۲-۴۹۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبیؐ کی یہ پانچوین جلد رجب ۱۳۵۴ھ مین بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگون کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظر ثانی کے لئے مجھے وقت نہین ملتا تھا، اس لئے یہ کام جلد انجام نہ پا سکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستون نے اس کام مین میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس مین یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگذاشتین جو طبع اول مین ہو گئی تھین ان کی اصلاح کر دی گئی ہے، پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے،

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشون سے درگذر فرمائے، اور میری لغزشون کو دوسرے کی لغزشون کا سبب نہ بنائے، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا،

داعی

سید سلیمان ندوی،
دار المصنفین اعظم گڈھ

۲۴ر جمادی الاولی ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبحان ربک رب العزة عما یصفون ○ وسلام علی المرسلین ○ والحمد للہ رب العلمین ○

دیباچہ

سیرۃ النبی صلعم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ مین شائع ہوئی تھی، آج تین۳ سال کے بعد اُس کی پانچوین جلد آپ کی خدمت مین پیش کیجا رہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہو کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے، اور اپنے بندون کے دلون کو اُس کے حُسنِ قبول کے لئے کھول دیا ہے،

موضوع

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس مین عبادت کی وہ حقیقت، اور اسلام مین اُس کے وہ اقسام وانواع اور اُن مین سے ہر ایک کی وہ مصلحت وحکمت اور اس باب مین گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذاتِ پاکِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے، جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ

ہی، تاہم وہی کہتا ہون جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا اُن سے راضی ہو) فرمایا، کہ "جو بات کہی گئی ہی اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو نفسِ خطاکار کا قصور ہی"۔

ان جلدون کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن مین یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہی کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیر کے واقعات سے نہین جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہین، بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونون سے یکسان ہے، صاف لفظون مین یون کہنا چاہیئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالون کا جواب ہی، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدین پہلے سوال کا جواب تھین، اور باقی جلدین دوسرے سوال کا جواب ہین،

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل مین مین نے امکان بھر اُس خاکہ کی پیروی کی ہے، جس کا خیال حضرة الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، اُن زبانی بیانون اور تلقینون کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو مین فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات مین لکھتے ہین،

"چاہتا ہون کہ ہر قسم کے مباحث سیرت مین آجائین یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا، اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزون ہوگا" گو لمبا ہے، اور ابھی مین نے فیصلہ نہین کیا، (بنام مولنا حبیب الرحمان خان شروانی ۱۹۱۲ء)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ مین انھون نے ان حصون کا عنوان منصبِ نبوت رکھا تھا، اور لکھا تھا

"دوسرا حصہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصبِ نبوت کے کامون کی تفصیل اس حصہ مین کی گئی ہے، اس حصہ

مین فرائضِ خمسہ، اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا، اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ، اور اُن کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ مین نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان مین کیا کیا اصلاحین عمل مین آئین، نیز یہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہو سکتا ہے"۔ (جلد اول طبع اول ص۶۲ و طبع دوم ص۹۷)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچوین جلد اور آیندہ دو جلدین درحقیقت اسی منصبِ نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہین، منصبِ نبوت، عرب کی گذشتہ حالت، اور تعلیم عقائد، چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائضِ خمسہ اُن کی مصلحتین اور حکمتین اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے حکمون کے لئے چھٹی جلد، اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہین، ساتوین جلد ہوگی، ان مین سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح مین مصنفِ اول کے ایماء کے مطابق قرآنِ مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیشِ نظر رہتی ہے، اُن کی مصلحتون اور حکمتون سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبون سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب مین کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے،

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ "مرا" گفت ہماں می گویم

حسنِ قبول اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اُس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی،

قبولِ خاطر دلہا خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی، اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہین نکلا، مجھ سے فرمایا "یہ کتاب وہان قبول ہوگئی" ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی وہ اعلاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوچکے، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانون مین اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی مین اس کی تین جلدون کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی مین اس کی چند جلدین کابل مین ترجمہ کی گئین، اور اب تک منتظر طبع ہین، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی مین مکہ معظمہ مین اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے،

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اُس زبان مین جس مین اس موضوع پر کوئی قابلِ توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑون کتابین نئے نئے دعوون کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہین، اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان مین بحمداللہ پیدا ہوگیا ہے، اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانون کا عام رجحان ہوگیا ہے،

امرائے اسلام کی امداد

اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنفِ مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تارِ نفَس محبتِ رسول صلعم کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی ملت محمدی کی خادمہ، اور اُمتِ محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہان بیگم سابق

فرمانروائے کشور بھوپال، (خدا اُن پر اپنی رحمتون کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء مین مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا، بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہین، اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی

مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہون مین بہر صورت
کہ ابرِ فیضِ سلطان جہان بیگم زر افشان ہی

رہی تالیف و تنقیدِ روایہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہی مری جان ہی

غرض دو ہاتھ ہین اس کام کے انجام مین شامل
کہ جن مین اک فقیر بینوا ہے ایک سلطان ہی

جب اس "فقیرِ بے نوا" کی وفات ہوئی، تو سرکارِ عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بینوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے"۔ آخر یہ سلطان بھی چل بسی، اور تالیف و تنقیدِ روایات کے ساتھ ساتھ "زرافشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہوگیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کر گئین، جس نے فرائضِ حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ اُن کے ناتمام کارنامون کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا، اور سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کی امداد مین وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال مین اللہ تبارک و تعالیٰ شانہٗ برکت عطا فرمائے کہ اُن کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑون آرزوئین پرورش پا رہی ہین، خلد اللہ ملکہٗ

۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء مین سیرت کی پہلی جلد جب چھپکر شائع ہوئی، تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلحضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک والممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کی پیشگاہِ خسروی مین پیش کیا، حضور ممدوح کو اپنے مولی و آقا حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات سید المرسلین محبوبِ رب العلمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوٰۃ کی ذاتِ قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہی، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے، اور دوسری جلدون کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کیلئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسون مین جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ مین پھنسا دیا تھا بیحد مدد ملی،

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز مین التجا ہے کہ وہ باقی جلدون کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلین طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے، دعا ہی کہ وہ بھی اسی سفر مین گذر جائے، اور آخر مین خوش قسمت سعدی کی طرح ہمین بھی یہ کہنے کا موقع ملے

منزل تمام گشت و بپایان رسید عمر ۔۔۔ ما ہمچنان در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گدہ

۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عملِ صالح

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لے کر آئے، اُس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات و فلاح دو چیزون پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبی کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح مین تھی، اب یہ پیشِ نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان مین ہے، ایمان بنیادی اصولون پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے، اور عملِ صالح ان اصولون کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کیلئے کافی نہین، جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزون یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی

قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام مین ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عملِ صالح کو نہین، حالانکہ یہ دونون لازم وملزوم کی حیثیت سے عملاً یکسان اہمیت رکھتے ہین، فرق صرف اتنا ہی کہ ایمان بنیاد ہے، اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہین رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہین ہوسکتی،

ان دونون کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہی، ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلون کا ثبوت محال ہی لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلون کا عمل نہ کیا جائے، تو فنِ تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمایش مین اقلیدس کا فن ایک ذرہ کارآمد نہین ہوسکتا اور نہ اُس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہوسکتے ہین، جو اس فن سے اصل مقصود ہین،

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ مین قرآنِ پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے، قرآنِ پاک نے انسان کی فلاح وکامیابی کے ذریعہ کو بیسیون آیتون مین بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عملِ صالح دونون پر اس کو مبنی قرار دیا ہی، اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عملِ صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا،

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ	زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے)
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	گواہ ہے کہ انسان گھاٹے مین ہی لیکن وہ
(عصر - ۱)	جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے،

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہے کہ اُن ہی افراد اور قومون

پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنھیں ربّانی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کے مطابق اُن کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ؀ (والتین-۱)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا، پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا، لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے،

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عملِ صالح کی بلندی ہے، یہود سے جن کو دعویٰ تھا کہ بہشت ان ہی کے ٹھیکہ میں ہے یہ فرمایا،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ (بقرہ ۹)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، وہی جنت والے ہیں،

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں، بلکہ ایمان اور عملِ صالح پر ہے، جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا، وہ اُسی کی ملکیت ہے، فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ کو

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (مائدہ - ۱۰)

اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو اُن پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائین گے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہی، کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہین اور نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے، اور اُن کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس مین نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا،

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِالْحُسْنٰى (کہف - ۱۱)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا مین) سزا دینگے، پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائیگا تو اس کو بری طرح سزا دے گا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بدلہ کے طور پر بھلائی ہی،

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ج وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ، (انبیار - ۷)

تو جو کوئی نیک عمل کرے، اور وہ مومن بھی ہو، تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اُسکے (نیک عمل) لکھتے جاتے ہین،

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا.

(مریم - ۴)

تو ان کے بعد اُن کے ایسے جانشین ہوئے جنھون نے نماز کو برباد کیا، اور نفسانی خواہشون کی پیروی کی، تو وہ گمراہی سے ملین گے، لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنت مین داخل ہون گے، اور اُن کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتون سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل ان ہی کو ہے، جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہین، اور جو عمل سے محروم ہین وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہین، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ، ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ط

(شوریٰ - ۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغون مین ہون گے، اُن کیلئے اُن کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہین، یہی بڑی مہربانی ہے، یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندون کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔

دوسری جگہ فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (کہف - ۱۲)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، اُن کی مہمانی کے لئے باغ فردوس ہیں،

پھر آگے چل کر فرمایا،

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف - ۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان مین بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس مین اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کرسکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہین جانتا وہ بارہا اس مین ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان، یا تنہا عمل کو نہین، بلکہ ہر جگہ دونون کو ملا کر نجات و فلاح کا ذریعہ بتایا ہے،

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (حج - ۷)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغون مین ہونگے،

اسی طرح قرآنِ پاک مین تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۰ موقعون پر یہ آیت ہے،

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، — جو ایمان لائے اور اُنھون نے اچھے کام کیے

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر مین ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہین، جو ایک دوسرے سے الگ نہین ہوسکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونون پر یکسان ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ مین پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے،

جن مسلمانون سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت وسلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہین جن مین ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ — تم مین سے اُن سے جو ایمان لائے اور

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ — نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ اُن کو

فِی الْاَرْضِ، (نور - ۷) — زمین کا مالک بنائے گا،

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی ان ہی سے تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا — اللہ نے ان مین سے اُن سے جو ایمان

الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا — لائے اور نیک کام کیے بخشایش اور

عَظِیْمًا، (فتح - ۴) — بڑی روزی کا وعدہ کیا،

بعض آیتون مین ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عملِ صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے، مثلاً ایک آیت مین یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید مین کہ بہشت مین صرف وہی جائین گے، فرمایا،

بَلیٰ مَنْ اَسْلَمَ وَجْہَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ	کیون نہین جس نے اپنے کو اللہ کے تابع
مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ	کیا، اور وہ نیکو کار رہی، تو اُس کی مزدوری
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ	اس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ
یَحْزَنُوْنَ، (بقرہ-۱۳)	ڈر ہے اُن کو اور نہ غم،

ان تمام آیتون سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے، کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہین، بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام نے پیشتر مذاہب مین افراط اور تفریط نمایان تھی، عیسائیون مین جیسا کہ پال کے خطوط[1] مین ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے، اور بودھ دھرم مین صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہین صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عملِ صالح) دونون اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہین، پھر یہ کہ ان اصولون کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عملِ صالح ہے، اور ہر قسم کی کامیابیون کا مدار ان ہی دو باتون پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصولِ طبی کو صحیح ماننے سے بیماریون سے نجات نہین پا سکتا جب تک وہ اُن اصولون کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہین، جب تک اُن اصولون کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے،

---

[1] رومیون کے نام ۳ و ۴،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز مین
فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	عاجزی کرتے ہین، جو نکمی باتون کی طرف
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	رُخ نہین کرتے، جو زکوۃ دیتے ہین،
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرتے
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ.....	ہین، . . . .
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا پاس
رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ	کرتے ہین، جو اپنی نمازون کے پابند
يُحَافِظُوْنَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ (مومنون-۱)	ہین، یہی بہشت کے وارث ہین،

اس دنیا مین اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، یہان کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہین ہو سکتی جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے، ہماری بھوک دفع نہین ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو جد و جہد کرکے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ مین نگلنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگین ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہین، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہین سکتے، جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگون کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دین، یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے، اسی طرح اس دنیا مین عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولون کو صرف صحیح باور کرتا ہے،

وہ اُس سے بہر حال بہتر ہے، جو اُن کو سرے سے نہین مانتا، کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آجانے اور نیک عمل بجانے کی اُمید ہوسکتی ہے، اور دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لئے آخرت مین بھی وہ منکر کے مقابلہ مین شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا،

اعمالِ صالحہ کی قسمین

عملِ صالح کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہین، تاہم اُن کی جلی تقسیمات حسبِ ذیل ہین، عبادات، اخلاق، معاملات،

اسلام مین لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہروہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائین تو وہ عبادات مین داخل ہین، مگر فقہار نے اصطلاحًا یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہین، جن کی تفصیل یون کیجاسکتی ہے کہ اوّلاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمین ہین، ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے، اُس کو عبادت کہتے ہین، دوسری وہ جس کا تعلق بندون سے ہے، اس کی بھی دو قسمین ہین، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جس مین قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے،

اعمالِ صالحہ کی ان ہی تینون قسمون کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبیؐ کی موجودہ اور آیندہ جلدون کا موضوع ہے،

عبادات

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ (بقرہ ۳)

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہین جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ مین بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے؛ اس سلسلہ مین اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے انسانون پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اس کا اصل جوہر یہ نہین ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقون کے بجائے اسلام مین عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانون کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقون کی تکمیل کی؛ مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کیگئی؛

اہلِ عرب جہان آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتون سے بیخبر تھے، وہان عبادت کے مفہوم و معنی اور اُس کے صحیح طریقون سے بھی ناواقف تھے، عرب مین جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت اُن کے سامنے پیش کر سکے

تھے، اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے، اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کرکے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انھوں نے اپنی عبادتگاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں، اور اُن میں بیٹھکر تمام دنیا کی جد وجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک "راہب متبتل" کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرء القیس کہتا ہے،

مَنارۃُ ممسی راھبٍ متبتّلٍ — دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے، ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خداپرستی نام کو نہ تھی، وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اُس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے، قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اُس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام، اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے[۱]،

یہودی جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں، اور مقبروں کو پوجتے تھے، انھوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے،

[۱] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹ و ۱۱، اور سورۂ حدید رکوع ۴۔

اوران کا نام انھون نے دینداری رکھا تھا، سورہ حدید مین قرآن پاک نے یہود اور نصاری دونون کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونون کے فسق مین نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین مین کمی اور سستی کرنا، اور نصاری کا فسق، دین مین زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین مین کمی اور زیادتی دونون گناہ ہین، اسی لئے قرآن نے دونون کو برابر کا فسق قرار دیا،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝ (حدید-۴)

اور ہم نے نوح اور ابرہیم کو بھیجا، اور ان کی نسل مین نبوت اور کتاب رکھی، تو ان مین سے کچھ راہ پر ہین، اور اکثر نافرمان ہین، پھر اُن کے بعد اُنکے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، اور انکو انجیل عنایت فرمائی، اور جنھون نے عیسیٰ کی پیروی کی اُن کے دل مین نرمی اور رحمدلی بنائی، اور ایک رہبانیت انھون نے نئی چیز نکالی، جو ہم نے اُن پر نہین لکھی تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انھون نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہیے تھا نہین نباہا، تو ان مین جو ایماندار تھے اُن کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور

اُن مین بہت سے نافرمان ہین،

ان آیتون سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین مین اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے، اسی لئے قرآن نے اُن کو بار بار کہا،

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (نساء-۲۳ و مائدہ-۱۰)	اپنے دین مین غلو نہ کرو،

اُن کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے، اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولون کو رسول بھی ماننا نہین چاہتے تھے، بلکہ اُن کو قتل کرتے تھے، وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بُت پرست ہمسایہ قومون کے بتون کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ تورات مین یہودیون کی بت پرستی اور غیر خداؤن کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے، اور قرآن مین اُنکے متعلق ہی

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ، (مائدہ-۹)	اور جنھون نے شیطان کو (یا بتون کو) پوجا

آنحضرت صلعم نے عیسائیون کو تبلیغ کی،

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ	مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس اُس سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ط	پہلے اور پیغمبر گذر چکے، اور اسکی مان ولی
وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ط کَانَا یَاْکُلٰنِ	تھی، دونون (انسان تھے) کھانا کھاتے
الطَّعَامَ، اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ	تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیون)
الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ	کے لئے اس طرح کھول کر دلیلین بیان
قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ	کرتے ہین، پھر بھی دیکھ وہ کدھر اُلٹے
مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّ لَا	جاتے ہین، (اُن سے) کہہ کہ کیا تم خدا

نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا
اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ
وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ
السَّبِيْلِ ۔ (مائدہ ۱۰)

کو چھوڑ کر ان (انسانون) کو پوجتے ہو
جن کے ہاتھ مین نہ نقصان ہی، نہ نفع،
اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہی،
جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہی، اے کتاب
والو! اپنے دین مین ناحق زیادتی نہ کرو
اور اُن لوگون کے خیال پر نہ چلو، جو بہک
گئے اور بہتون کو بہکایا اور سیدھے راستہ

اُن کی حالت یہ تھی،

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (توبہ ۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالمون اور درویشون
کو خدا بنا لیا تھا،

اس زمانہ مین عیسائیون کے جو گرجے اور پرستشگاہین عرب مین اور خصوصاً ملک حبش مین تھین، ان مین حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، اور حواریون، ولیون اور شہیدون کی تصویرین، اور مجسمے نصب تھے، عبادت گذار اُن کے آگے دھیان اور مراقبہ مین سربسجود رہتے تھے، صحابہ مین سے جن لوگون کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا مین ان معبدون کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اُن مین سے بعض بی بیون کی نگاہ مین ان بزرگون کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی چنانچہ آنحضرت صلعم کے مرض الموت مین بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا، اور اُن کی تصویرون اور مجسمون کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "خدا یہود و نصاریٰ پر

لعنت بھیجے، انھون نے اپنے پیغمبرون کی قبرون کو عبادت گاہ بنالیا، تم ایسا نہ کرنا، ان مین جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے، اور اس مین اسکی تصویرین کھڑی کردیتے تھے[1]:

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوالِ روم کی متعدد جلدون کے خاص ابواب مین عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہین وہ تمام تر حدیثِ مذکور کی تصدیق و تائید مین ہین، خصوصًا تیسری اور پانچوین جلد مین حضرت عیسٰیؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ پال، اور متعدد ولیون اور شہیدون کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقون کی پرستش گاہون کے درودیوار سے قرآنِ پاک کی صداقت کی آوازین آرہی ہین، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مومی تبیون کی روشنی مین اُن کے آگے مراقبون اور تسبیحون مین سرنگون نظر آتے ہین، روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤن مین یہ منظر مین نے خود اپنی آنکھون سے دیکھا ہے، اور اُس وقت محمد رسول اللہ صلعم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھون کے سامنے تھی،

یہودیون اور عیسائیون کو چھوڑکر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بیخبر تھے، لات، عزّیٰ، ہبل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتون کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، اُن پر جانور قربانی کرتے، اور اپنی اولادون کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات مین مختلف بتخانون کے میلون

---

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد،

مین شریک ہوتے تھے، اور پتھرون کے ڈھیرون کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے خانۂ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتون کا مرکز تھا، اور اُن کی نماز یہ تھی کہ خانۂ کعبہ کے صحن مین جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتون کو خوش اور راضی رکھین، قریش کا موحد زید بن عمرو جو انحضرت صلعم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ "اے خدا مجھے نہین معلوم کہ مین تجھکو کس طرح پوجون اگر جانتا تو اُسی طرح عبادت کرتا[1]"

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر مین یہ ترانہ گا رہے تھے اور انحضرت صلعم سُن رہے تھے[2]

واللہ لولا انت ما اھتدینا	ولا تصدقنا ولا صلینا
خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے	نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے،

اس شعر مین اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقون سے آشنا کیا،

عرب سے باہر بھی کہین خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بُت پرست یونانی اپنے بادشاہون اور ہیرو ؤن کے مجسمے اور ستارون کے ہیکل پوجتے تھے، روم ایشیائے کوچک، یورپ افریقہ مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکون مین حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، اور سینکڑون ولیون اور شہیدون کی مورتیان، اور ہڈیان، اور اُن کی مصنوعی یادگارین پوجی جارہی تھین، زردشت کی مملکت مین آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتون ہماد ھون اور اس کی جلی ہوئی ہڈیون کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو، [2] صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتون مین مختلف ہے،

کے کنفوشس اپنے باپ دادون کی مورتون کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان مین سورج دیوتا، گنگا مائی، اور اوتارون کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی مین مبتلا تھے باقی تمام دنیا درختون، پتھرون، جانورون، بھوتون اور دیوتاؤن کی پرستش کر رہی تھی، غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش مین مصروف تھی، ایک بے آب وگیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	لوگو! اپنے اُس پروردگار کی پرستش
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلون
قَبْلِكُمْ، (بقرہ-۳)	کو پیدا کیا،

سابق کتب الٰہی کے امانت دارون کو آواز دی گئی،

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً
سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا	متحد ہو جائین جسمین ہم تم عقیدۃً متفق ہین،
نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ،	کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش
(آل عمران-۷)	نہ کرین،

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستون نے سُنی، اور پکار اُٹھے،

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ		خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز
لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ	(آل عمران-۲۰)	سُنی، کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو
فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا،		ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر

ان واقعات کو سامنے رکھکر آنحضرت صلعم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ مین آپ کی زبانِ عبودیت ترجمان سے بارگاہِ الٰہی مین کیگئی تھی،

"خداوندا! تیرے پوجنے والون کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین مین تیری کبھی پرستش نہ ہوگی"۔

خدانے اپنے نبیؐ کی دعا سُنی، اور قبول فرمائی، کیونکہ خاتم الانبیاءؐ کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا،

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ مین نبوتِ محمدیؐ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدون سے تمام باطل معبودون کو باہر نکال کر پھینکدیا، باطل معبودون کی عبادت اور پرستش یکقلم محو کردی، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنین جھکادین، اور صاف اعلان کردیا کہ

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان
اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۔ (مریم ۔۶)	خدا کے سامنے غلام ہی بنکر آنے والی ہے

خدا کے سوا نہ تو آسمان مین، نہ زمین مین، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے، کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ، اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے، اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے، اور نہ اسکی نذر مانی جاسکتی ہے، اور نہ اس سے دعا مانگی جاسکتی ہے، ہر عبادت صرف اسی کیلئے اور ہر پرستش صرف اُسی کی خاطر ہے،

لہ صحیح مسلم و جامع ترمذی، غزوۂ بدر،

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ	بے شبہہ میری نماز اور میری قربانی، اور
وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	میری زندگی اور میری موت سب اُسی
(انعام - ۲۰)	ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے،

کفار کو بتون، دیوتاؤن، ستارون، اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا، اور انہین ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہین لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا، تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا	اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو مین
تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	نہین پوجتا، اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو
مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا	جس کو مین پوجتا ہون اور نہ مین اس کو
عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ	پوجنے والا ہون جس کو تم نے پوجا اور نہ
مَآ اَعْبُدُ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ	تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو مین پوجتا
دِیْنِ ۝ (کٰفِرُوْن - ۱)	ہون، تمھارے لئے تمھارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین

خارجی رسوم کا وجود نہین — خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا مین جاکر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب[1]، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت[2]، نہ دیوتاؤن، دیبیون، بزرگون اور ولیون کے مجسمون کو پیش نظر رکھنے کی اجازت[3]، نہ سامنے موم بتیون کے روشن کرنے کا حکم[4]، نہ

---

[1] جیسا کہ ہندؤن مین ہے، [2] جیسا کہ پارسیون مین ہے، [3] جیسا کہ ہندؤن، عام بت پرستون اور رومن کیتھولک میں ہے، [4] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیون مین ہے،

گھنٹون اور ناقوسون کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنون کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑون کی قید[1]، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لئے صرف ایک پاک سترپوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہی، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہوجائے تو یہ بھی معاف ہی،

درمیانی آدمی کی ضرورت نہین

اسلام مین عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہین، محمد رسول اللہ صلعم کے دین مین ہندون کی طرح نہ برہمن ہین، نہ پروہت ہین، نہ پجاری ہین، نہ یہودیون کی طرح کاہن ہین، نہ ربّی ہین، نہ حاخام ہین، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیون کی طرح عبادتون کی بجاآوری کے لئے پادریون اور مختلف مذہبی عہدہ دارون کی ضرورت ہی، اور نہ پارسیون کی طرح دستورون اور موبدون کی حاجت، یہان ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتین کرتا ہے، آپ عرضِ حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہان یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہِ راست پکارو، مین جواب دونگا

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ (مومن-۶)
تم مجھے پکارو مین تم کو جواب دونگا،

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتون کو دلکش، دلفریب، موثر اور بارعب بنانے کیلئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہین ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازین تھین، کہین ساز و ترنم، اور

[1] یہ چیزین یہودیون کے ہان ہین، پارسیون مین سپید کپڑون کی اکثر ضرورت ہی،

نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دینِ محمدیؐ کی سادگی نے اُن میں سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کیلئے دل کے ساز، اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے،

مکان کی قید نہیں ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے، بُت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں، اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ، اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ، بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اُس کا معبد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے،

وجعلت لی الارض مسجدا[1]، اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی،

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشتِ چمن میں ہو کہ ہنگامۂ کارزار میں خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو، اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو، یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بُت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو،[2]

[1] بخاری کتاب الصلوۃ باب قول النبی صلعم جعلت لی الارض مسجدا و طهورا، [2] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوۃ فی البیعۃ

خاص خاص عبادتون کے وقت مختلف سمتون اور چیزون کی طرف رُخ کرنا بھی ہر مذہب مین ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانون کو ایک واحد رُخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ اُن مین وحدت کی شان نمایان ہو مسلمانون کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی، اور اس کیلئے اسلام مین مسجد ابراہیمی کی تخصیص کیگئی ہی، کہ وہ دنیا مین خداے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اس کی حیثیت وہ نہین قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلون کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے حدود سے پاک ہی، وہ ستارون کے رُخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہین، دنیا کے مختلف ملکون کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رُخ کرتے مین، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی، اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہین، اور خود خانۂ کعبہ کے صحن مین بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اُس کی طرف رُخ کیا جاتا ہے، اگر کسی سبب سے اُس رُخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رُخ کرو، اودھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت مین عام نفل نمازون کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہین، جدھر سواری کا رخ ہو اُدھر ہی سجدہ کیا جاسکتا ہی، لڑائیون مین ہر رخ پر نماز برابر ادا کیجاسکتی ہی، اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے، تب بھی اُس رُخ کھڑا ہو جانا کافی ہے، کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو،

انسانی قربانی کی ممانعت بعض مذاہب مین خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی، کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر، یا دریا مین ڈبا کر یا آگ مین جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ مین اپنی جان قربان کرنا اصل مین یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت مین، یا کمزورون کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروا

نہ کیجائے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا میں ڈوب مرا جائے، یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اُس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دیجائے گی"[1]

حیوانی قربانی میں اصلاح

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا، عرب میں اُس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے، اور اُس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہلِ عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اُس کے خون کا چھاپ دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے، اور اُس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے، اُن کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی، اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے، بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اُس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے، پیغام محمدی نے اِن سب طریقوں کو مٹا دیا، اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے، فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا	اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ	خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری
(حج - ۵)	پہنچتی ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ، [2] احبار - ۲۱ - ۶،

اسلام نے تمام عبادات مین صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے، اور اہلِ استطاعت کے لئے جو موقع حج پر نہ گئے ہون، مقام حج کی یاد کے لئے قربانی مسنون کیگئی ہے، تاکہ اُس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر مین اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اُس کو آزمائش مین پورا ہوتا دیکھ کر اُس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھدی، اور اس کے پیرون مین اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہوگئی،

اسی کے ساتھ پیامِ محمدیؐ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتون کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا، یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہین ہے، بلکہ اس سے مقصد دو ہین، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اُس نے جانورون کو ہماری ضرورتون مین لگایا اور اُن کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا، اور دوسرا یہ کہ اُن کا گوشت غریبون، مسکینون اور فقیرون کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کیجائے، چنانچہ فرمایا،

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ، (حج - ۵)	ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان جانورون پر خدا کے نام کی یاد کرین جو ہم نے اُن کو روزی کی، تو تمھارا خدا ایک خدا ہی ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ، اور عاجزی کرنے والے بندون کو خوشخبری سنا دے،

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ
شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ
فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ
فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ
كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ
(حج - ۵)

اور قربانی کے جانورون کو خدا کی نشانیان
بنایا ہے، تمھارے لئے اُن مین بہت فائدے
ہین، اُن کو قطار مین کھڑا کرکے تم اُن پر
خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بھل گرین
(یعنی ذبح ہوچکین) تو اُن مین سے کچھ خود
کھاؤ، اور باقی قناعت پسند فقیرون اور
محتاجون کو کھلادو، اسی طرح ہم نے اُن
جانورون کو تمھارے کام مین لگایا ہو کہ خدا

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ، عرب مین دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ مین قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگون نے اسکے متعلق آپ سے پوچھا، آپنے فرمایا "خدا کے نام سے جس مہینہ مین چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو، اور (غریبون کو) کھلاؤ"[1]، غرض قربانی کی یہی دو حقیقتین ہین، صرف خون بہانے کیلئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہین، اور نہ یہ خون بہانا مشرکون کی دیبیون اور دیوتاؤن کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے

مشرکانہ قربانیون کی ممانعت

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیان جو عرب مین جاری تھین بند کردی گئین، عرب مین جانورون کے قربانی کرنے، اور اُن کو بتون پر چڑھانے کے

---

[1] ابوداؤد، باب فی العتیرہ، جلد دوم ص۵ ،

مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتون کے نام پر عموماً اسکی قربانی کردیتے تھے، اور اسکی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ مین ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام عتیرہ تھا، اسلام نے ان دونون قربانیون کو ناجائز قرار دیا، اور رجب کی تخصیص باطل کردی،

قال لا فرع ولا عتیرۃ[1]، آپنے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہین ہے،

بتون کے نام پر مختلف نامون سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے، اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام مین استعمال نہین کرسکتا تھا، چنانچہ قرآن مجید مین اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی،

ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام (مائدہ-۱۲) نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا،

مردون کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے، لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحین کین، اس کے سلسلہ مین اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا،

لا عقر فی الاسلام[2]، اسلام مین قبر کے پاس جانورون کا ذبح کرنا جائز نہین،

عرب جاہلیت مین یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمایش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہوکر جانورون کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح

[1] ابوداود کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵۔ [2] ابوداود کتاب الجنائز، باب کراہیۃ الذبح عند القبر جلد ۲ ص ۲۳،

کرتا، پھر اُس کے مقابل مین دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا، جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا[1]،

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہین،

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اُس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفین دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا، اسی قدر روح مین زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی، چنانچہ یونانی فلسفیون مین اشراقیت، عیسائیون مین رہبانیت اور ہندوون مین جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی ہفتہ مین یا چالیس دن مین ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا، اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی چلّہ کی سردی مین اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانون اور غارون مین چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد، اور ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا، لیکن نبوتِ محمدی نے یہ راز آشکارا کیا، کہ ان مین سے کوئی چیز عبادت نہین، نہ ترکِ لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے، اور نہ بندون کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے، خدا کا دین اتنا ہی

---

[1] ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵،

ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے، اس نے کہا،

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا. (بقرہ - آخر)	خدا کسی کو اس کی گنجایش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہین دیتا،

اسلام مین روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضون کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہین اسلام نے اس مین متعدد آسانیان پیدا کر کے کہا،

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ. (بقرہ - ۲۳)	خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہین،

حج بھی سب لوگون پر مشکل تھا، تو ساتھ ہی فرمادیا،

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا، (آل عمران - ۱۰)	جس کو (زاد راہ اور چلنے کی) استطاعت ہو، اسی پر حج فرض ہے،
وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ. (حج - ۱۰)	اور تمھارے لئے دین مین اس نے (خدا نے) تنگی نہین کی،

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا،

اِنَّ ھٰذَا الدِّیْنَ یُسْرٌ وَلَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ[1]،	یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی مین مقابلہ کرے گا، تو دین اس کو

اور فرمایا

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی،

اِنَّمَا اُنَا بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السَّمْحَةِ	مین تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین
اوالسہلۃ الحنیفیۃ البیضاءؔ[1]	دے کر بھیجا گیا ہون،

مذہب مین رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دینِ حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اُس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا،

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا	اور عیسائیون نے ایک رہبانیت کی بدعت
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ	نکالی اور ہم نے اُن کو خدا کی خوشنودی
رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ	حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہین دیا تھا
رِعَايَتِهَا، (حدید۔۴)	تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا

ان لوگون سے جنھون نے اچھے کھانون اور زیب و زینت کی جائز چیزون کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي	پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب زینت اور
أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ	رزق کی اچھی چیزون کو جن کو خدا نے
الرِّزْقِ، (اعراف۔۴)	اپنے بندون کے لئے بنایا، کس نے حرام کیا،

اسلام نے اس مسئلہ مین یہانتک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بعض بی بیون کی خوشنودیِ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶،

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝	اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا، تو اس کو اپنی بی بیون کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیون کرتا ہے،
(تحریم-۱)	اور خدا بخشنے والا مہربان ہی،

صحابہؓ مین بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبون کے اثر، یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرد، ترکِ لذائذ، اور ریاضاتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، آنحضرت صلعم نے اُن کو اس سے باز رکھا، اور فرمایا کہ مین یہ شریعت لیکر نہین آیا، قدامہؓ بن مظعون اور اُنکے ایک رفیق نے دربارِ رسالت مین حاضر ہوکر عرض کی یا رسول اللہ! ہم مین سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپنے فرمایا "مین تو دونون باتین کرتا ہون" یہ سُن کر دونون صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے[1]،

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھین گے، اور رات بھر عبادت کرین گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپنے اُن سے فرمایا کہ "اے عبد اللہ! تم پر تمھارے جسم کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ مین تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے[2]"، اسی قسم کی نصیحت آپنے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت مین مصروف رہتے ہین، بیوی سے کوئی

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم، [2] ایضاً

تعلق نہین رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہین، رات کو سوتے نہین آپ نے اُن کو بلا کر پوچھا کہ "کیون عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے" عرض کی "خدا کی قسم مین نہین ہٹا ہون مین آپ ہی کے طریقہ کا طلبگار رہون" فرمایا "مین سوتا بھی ہون اور نماز بھی پڑھتا ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون، اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمھارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہی، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1]

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ مین واپس گئے، تو انھون نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس مین حاضر ہوئے تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ان کو پہچان نہ سکے، انھون نے اپنا نام بتایا، تو فرمایا "تم خوشرو تھے، تمھاری صورت کیون ایسی ہوگئی" عرض کی "یارسول اللہ صلعم جب سے آپ سے مل کر گیا ہون متصل روزے رکھتا ہون" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیون عذاب مین ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ مین ایک روزہ کافی ہے" انھون نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپ نے مہینہ مین دو روزون کی اجازت دی، انھون نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ مین تین روزے کر دیئے، انھون نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزون کی اجازت دی[2]، ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواج مطہراتؓ کی خدمت مین حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب مایومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد باب صوم اشہر الحرم،

کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسولِ خدا صلعم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھون نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلعم سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہین، ان مین سے ایک صاحب نے کہا مین تو رات بھر نمازین پڑھون گا، دوسرے صاحب بولے مین عمر بھر روزے رکھون گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ مین عمر بھر مجرد رہون گا، کبھی نکاح نہ کرون گا، آنحضرت صلعم اُن کی یہ گفتگو سُن رہے تھے، ان کو خطاب کرکے فرمایا "خدا کی قسم مین تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہون تاہم مین روزہ رکھتا ہون، اور افطار بھی کرتا ہون رات کو نماز بھی پڑھتا ہون، اور سوتا بھی ہون، اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، جو میرے طریقہ پر نہین چلتا وہ میری جماعت مین نہین[1]"

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہین کرسکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادین، انھون نے آنحضرت صلعم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی، تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہین اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے[2]،

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمامِ بلیغ کے ساتھ لوگون کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا،

آپ نے کبھی کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی مین اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح، [2] صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب النکاح،

اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہین، اس لئے انھون نے افطار نہ کیا، آپنے دو دن روزہ رکھے تھے، کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپنے افطار کرلیا، اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑہ سکتا تو مین اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب مین غلو کرنے والون کا سارا غلو رہجاتا، صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ! پھر آپ کیون کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہین، فرمایا "تم مین سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے[1]" اسی لئے اسلام مین عام اُمت کے لئے یہ روزے نہین ہین،

ایک دفعہ ایک مسجد مین آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے مین ایک رسی لٹک رہی ہے دریافت کیا تو لوگون نے کہا، یہ زینبؓ نے باندھی ہے، رات کو نماز مین جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہین تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہین، یہ سن کر آپنے فرمایا، "یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم مین نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے[2]"

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری، حضرت عائشہؓ نے کہا "یہ خولاءؓ ہے، لوگ کہتے ہین کہ یہ رات بھر نہین سوتی اور عبادت مین مصروف رہتی ہے" فرمایا کہ "یہ رات بھر نہین سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے[3]"

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازون مین مشغول رہتے تھے ان کو مخاطب کرکے فرمایا،

اکلفوا من العمل ما تطیقون	اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کرسکو،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصوم [2] جمع الفوائد بحوالۂ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابوداؤد و عن انس جلد اول صفحہ ۔ طبع میرٹھ، باب الاقتصاد فی الاعمال، [3] جمع الفوائد بحوالۂ صحیحین موطا و نسائی،

فان اللہ لا یمل حتی تملوا — کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہیں اکتا،

فان احب العمل الی اللہ — خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے

ادومہ وان قل[1]، — جس کو تم ہمیشہ کرسکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو،

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں بعض حاجی یہ عہد کرلیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے، اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے، یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے، اور اس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کردیا، کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں، حضرت عقبہؓ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی، کہ وہ پیدل حج کریگی، عقبہ نے آکر آنحضرت صلعم سے فتویٰ پوچھا، آپنے جواب دیا خدا کو تمھاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں[2]، اسی طرح آپنے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپنے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا، اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپنے فرمایا "میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو تو[3]" ایک دفعہ حج کے سفر میں آپنے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپنے دریافت فرمایا، تو

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ، [2] ابوداؤد و مسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور، [3] صحیح بخاری جلد ۱، صفحہ ۱۸۲،

معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے، فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہین کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب مین ڈالے، اُس کو سوار کر دو"[1]

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ مین ننگے سر کھڑا ہے، آپ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگون نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا، بیٹھے گا نہین، اور نہ سایہ مین آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا، اور برابر روزے رکھیگا، آپ نے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ باتین کرے، بیٹھے سایہ مین آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے"[2]

حج مین دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک مین نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ نے جا کر نکیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ"[3]

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتون کے متعلق عیسائی راہبون کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ نے[4] فرمایا

لا تشددوا علی انفسکم فانما	اپنی جانون پر سختی نہ کرو، کہ تم سے پہلے قومین
هلك من كان قبلكم بتشديدهم	اپنی جانون پر سختی کرنے سے تباہ ہوئین اور
علی انفسهم و ستجد و ن بقایاهم	ان کی بقیہ نسلین آج بھی گرجون اور دیرون
فی الصوامع والدیارات	مین تم کو ملین گی،

[1] ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن جارود و کتاب الایمان والنذور، [2] صحیح بخاری، ابوداؤد و ابن جارود و کتاب الایمان والنذور [3] صحیح بخاری ایمان و نذور، [4] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی و ابوداؤد صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال

خاتم الانبیا صلعم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقون کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، آپنے فرمایا،

لا رھبانیۃ فی الاسلام (ابوداؤد) — اسلام مین رہبانیت نہین،

عُزلت نشینی اور قطعِ علائق عبادت نہین،

اکثر مذاہب نے دینداری اور خداپرستی کا کمال یہ سمجھا تھا، کہ انسان کسی غار کھوہ یا جنگل مین بیٹھ جائے اور تمام دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے، اسلام نے اسکو عبادت کا صحیح طریقہ نہین قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندون کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہمجنسون سے الگ ہو کر ایک گوشہ مین بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے، اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہین، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہی کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم مین گرفتار ہو کر ان مین سے ہر ایک کے متعلق جو اُس کا فرض ہی اسکو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات وعلائق اور حقوق وفرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیرون کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے، جو ان سب جھمیلون کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولین، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہین، بلکہ اداے فرض ہی، ترکِ عمل نہین، بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہین، بلکہ کرنا ہی،

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلعم نے بعض اُن صحابہ کو جو اہل وعیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے، اور راتون کو عبادت کرتے تھے، فرمایا اے

فلان! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمھاری بیوی بچون کا بھی حق ہی، تمھارے مہمان کا بھی حق ہی، تمھاری جان کا بھی حق ہی، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے[1] اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر مین عبادت اُن حقوق کو بجا لانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہین، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ مین ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جس مین موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیان بھی تھین، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت مین آکر عرض کی، یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہان ضرورت کی سب چیزین ہین، جی چاہتا ہی کہ وہان گوشہ گیر ہو کر ترکِ دنیا کرون، آپنے فرمایا "مین یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا مین نہین آیا ہون، مین آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہون[1]"

اسلام سے پہلے آنحضرت صلعم غارِ حرا مین کئی کئی دن جاکر رہا کرتے تھے، اور عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپکے پاس آیا، اور دعوت و تبلیغ کا بار آپکے مبارک کندھون پر رکھا گیا، شب و روز مین رات کی چند ساعتین اور سال مین رمضان کے چند اخیر دن گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی مین بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کیساتھ مل کر خالق کی عبادت، اور پھر مخلوق کی خدمت مین صرف ہوتے تھے، اور یہی تمام خلفا اور عام صحابہؓ کا طرزِ عمل رہا، اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادھی عبادت تھی[2]،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶، [2] اسلام مین گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعون پر ہی، ایک اس شخص کے لئے جسمین فطرۃً بدی ہے، جس کی سرشت دوسرون کو نفع پہنچانا نہین بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلعم نے اسکو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگون سے قطع تعلق کرے، صحیح بخاری مین ہی کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ مین قربان کرتا ہی، دوسرے وہ جو کسی

اسلام مین عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا، کہ اسلام مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین، جو دوسرے مذہبون مین پایا جاتا ہی، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحِ شریعت مین خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا، اور اُس کے احکام کو بجالانا ہی، اسی لئے قرآنِ پاک مین عبادت کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) گھاٹی مین بیٹھکر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگون کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے[1]، اس تعلیم نبوی نے انسانون کی دو قسمین کر دین ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہی، تو اُن پر یہ فرض ہی کہ وہ مجمع اور ہجوم مین رہ کر اُن کی بھلائی کا فرض انجام دین، یہان تک کہ اس راہ مین اُن کی دولت بھی خرچ ہو جائے، اور اُن کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہین جن مین طبعًا مردم آزاری اور دوسرون کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہی، اُنکی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی مین ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت مین اپنا وقت صرف کرین، تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ اُنکے آزار سے محفوظ رہین

دوسرا موقع جس مین آنحضرت صلعم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہی، وہ ہی جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک مین فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو، کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو، تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہو کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "ایک ایسا زمانہ لوگون پر آئیگا جس مین ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لیکر وہ بارش کی جگہون اور پہاڑون کی گھاٹیون کو تلاش کریگا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنون سے بچا سکے" (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہین، پہلے موقع مین ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا، جماعت اور فرد دونون کے لئے فائدہ مند ہی، اور دوسرے موقع پر جبکہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہو اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور رشید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھکر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء،

مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ	(مومن - ۶)	جو میری عبادت سے غرور کرتے ہین
عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ		وہ جہنم مین جائین گے،

فرشتون کے متعلق فرمایا،

وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ	جو اس کے پاس ہین وہ اس کی عبادت
عَنْ عِبَادَتِہٖ (انبیا - ۲)	سے غرور نہین کرتے،

سعادت مند اور باایمان مسلمانون کے متعلق فرمایا،

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا	میری آیتون پر وہی ایمان لاتے ہین
ذُکِّرُوْا بِہَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ	جن کو ان آیتون سے سمجھایا جائے تو
سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَہُمْ	وہ سجدہ مین گر پڑتے ہین، اور اپنے پروردگا
لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ، (سجدہ - ۲)	کی پاکی بیان کرتے ہین، اور غرور نہین کرتے

اس قسم کی اور آیتین بھی قرآن پاک مین ہین جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہین، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ مین اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا، اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہی، تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اُس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان مین عبادت، بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود، خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی

انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے لیکن اس سے اسکا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت مین داخل کرنے کیلئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے، قرآن پاک مین یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے،

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي	دوزخ سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو
مَالَهُ يَتَزَكَّى وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ	اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے،
مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَى إِلَّا ابْتِغَاءَ	اس پر کسی کا احسان باقی نہین جس کا
وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى وَلَسَوْفَ	بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدائے برتر
يَرْضَى، (لیل-۱)	کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا،
وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ	صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے
اللَّهِ، (بقرہ-۳۷)	جو تم خرچ کرو،
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ،	ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے
(انسان-۱)	ہین،
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ	پھٹکار ہو ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے
عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ	غافل رہتے ہین، اور جو دکھاوے کیلئے
هُمْ يُرَاءُونَ، (ماعون-۱)	کام کرتے ہین،

قرآن کی ان آیتون کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلعم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقرون مین فرما دی کہ

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (صحیح بخاری و مسلم)	اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے،

اسی کی تشریح آپ نے اُن لوگون سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کرکے مدینہ منورہ آرہے تھے

لکل امرء مانوی فمن	ہر شخص کو وہی ملیگا جس کی اُس نے نیت کی،
کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ	اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک
فہجرتہ الی اللہ، ومن کانت	پہنچنا ہو تو اس کی ہجرت خدا کی طرف ہے،
ہجرتہ الی دُنیا یصیبہا او امرءۃ	اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے، یا کسی
ینکحہا فہجرتہ الی ما ھاجر	عورت کے لئے ہو، تو اس کی ہجرت اُسی
الیہ، (بخاری باب اول)	طرف ہو جسکی نیت سے اُس نے ہجرت کی،

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلعم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، اس مین پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس مین کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہین ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی، اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھون دے ڈالو، تو وہ عبادت نہین، لیکن خدا کی رضاجوئی اور اُس کے حکم کی بجاآوری کے لئے چند کوڑیان بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہو،

تعلیمِ محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی، اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے، اور یہی "عبادت" سے اسلام کا اصلی مقصود ہے،

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ	کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلون کو پیدا
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ-۳)	کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو،

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے،

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل مین تمام نیک کامون کی تحریک اور بُرے کامون سے نفرت ہوتی ہے، آپنے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے[1]، اور قرآن نے بھی تقوی القلوب "دلون کا تقویٰ" کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام مین عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز روزہ اور تمام عبادتین سب اسی کے حصول کی خاطر ہین، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر مین یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہین،

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت مین یون ادا کر سکتے ہین، کہ پہلے عام طور یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند اُن مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے، مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے، ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو، اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے، اسلام مین خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو، یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن اُس کام کرنے سے اُس کام کے کرنے والے کا مقصود نمایش، دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسرون کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو،

اس تشریح کے رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم

[1] مسلم کتاب البر والصلة باب تحریم ظلم المسلم صفحہ ۳۲۳ ج ۲ رکوع ۲۴

کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس کو دفعتہً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام مین دو حریف کی نہین رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے، دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہین، اسلام کی نظر مین اگر وہ کام اسی طرح کئے جائین، لیکن اُن کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمایش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہین، دین کے کام ہین، اس لیئے دین اور دنیا کے کامون مین، کام کا تفرقہ نہین، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت صلعم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت مین مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، کہ اس کو آرام دو، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اُس کو کچھ دیر سونے دو، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اوسکی تسلی کرو، اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے[1]، کہ اُس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اُس کی عبادت ہی، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ	اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور
طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا	ستھری چیزین روزی کی ہین، اُن کو کھاؤ
لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ	اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت
(بقرہ ۔ ۲۱)	کرتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف،

ہے، ایک اور آیت مین توکل یعنی کامون کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود-۱۰) — اسکی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو

اسی طرح مشکلات مین صبر و استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا،

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم-۴) — اس کی عبادت کر اور صبر کر،

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے،

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى (بقرہ) — اچھی بات کہنا اور معاف کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو،

اسی آیتِ پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ مین فرمائی ہے،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ، (بخاری کتاب الادب) — ہر نیکی کا کام خیرات ہے،

تبسمك فی وجه اخيك صدقة، — تمھارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے

واماطة الاذى عن الطريق صدقة، — راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے،

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتون سے بڑھ کر ہے، فرمایا،

الساعی علی الارملة والمسكين كالمجاهد فی سبيل وكالذی — بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ مین جہاد کرنے والے

يصوم النهار ويقوم الليل — برابر ہے، اور اس کے برابر ہے جو دن

(بخاری، ادب) — بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو،

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا، ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا،

الا اخبركم بافضل من درجة — کیا میں تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی

الصيام والصلوٰة والصدقة — بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصلاح ذات البين[1]، — وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے،

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابو درداؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ انکی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی، تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے، اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا، تو ابو درداؓ نے کہا میں روزے سے ہوں، حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا، آخر انھوں نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابو درداؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا اے ابو درداؓ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے، سب کو ادا کرو، حضرت ابو درداؓ نے حضرت صلعم کی خدمت

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲،

مین آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپنے فرمایا کہ "سلمان نے سچ کہا"[1]

لوگون نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ تمام کامون مین سب سے بہتر کون کام ہے"۔ فرمایا "خدا پر ایمان لانا، اور اس کی راہ مین جہاد کرنا"۔ لوگون نے پوچھا "کس غلام کے آزاد کرنے مین زیادہ ثواب ہے"، ارشاد ہوا "جس کی قیمت زیادہ ہو، اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو"۔ انھون نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو، اس کا کام کردو"۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے، فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگون کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو"[2]

ایک دفعہ آپنے صحابہؓ سے فرمایا، خدا اپنے بندون سے کہے گا کہ "مین نے تم سے کھانا مانگا، تم نے نہ کھلایا"۔ وہ عرض کرینگے "خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے"۔ فرمائیگا "کیا تم کو معلوم نہین کہ میرے فلان بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے"۔ "اے ابن آدم! مین نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہ پلایا"۔ وہ کہیگا کہ "اے پروردگار! مین تجھکو کیسے پانی پلاؤن، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے"۔ وہ فرمائیگا "تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلان بندہ نے پیاس مین تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا"۔ "اے ابن آدم! مین بیمار ہوا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی"، وہ کہیگا "اے پروردگار! مین کیونکر تیری بیمار پرسی کرون، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے"۔ فرمائیگا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی،

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف صفحہ ۹۰۶، [2] ادب المفرد امام بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ،

اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا۔[1]

اس مؤثر طریقۂ ادا نے خداشناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو برتو پردے چاک کر دیے، اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اُس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے، کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دیدیں، آپ نے اُنھیں بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے، اس کا تم کو ثواب ملیگا، یہانتک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں بھی دو، اُس کا بھی ثواب ہے۔"[2] ابومسعودؓ انصاری سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔"[3] غریب و نادار صحابہؓ نے دربارِ رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہ! دولتمند لوگ ثواب میں بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، اُن کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے۔" فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمھارا سبحان اللہ اور الحمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہانتک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے، وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے، لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے۔" فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا، پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملیگا۔"[4]

محمد رسول اللہ صلعم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے، اور کتنی تو برتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح

[1] ادب المفرد امام بخاری باب عیادۃ المرضیٰ [2] ادب المفرد باب یوجر فی کل شئی، [3] صحیح بخاری کتاب النفقات، [4] ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ،

کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحیِ محمدیؐ نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض وغایت عبادتِ الٰہی قرار دی ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ	اور مین نے انسانون کو اور جنون کو اسی لئے
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (ذریٰت۔۳)	پیدا کیا ہے، کہ وہ میری عبادت کرین

اِس آیتِ پاک مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کامون تک وسیع ہو جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اُس کی اطاعت، اور اُس کی خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہین، جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا،

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت مین چار عبادتین فرض ہین یعنی نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، در حقیقت یہ چارون فریضے عبادت کے سیکڑون وسیع معنون، اور اُن کے جزئیات کے بے پایان دفتر کو چار مختلف بابون مین تقسیم کر دیتے ہین، جن مین سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد و جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوانِ باب ہے، جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرون مین ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہین، اسی طرح یہ چارون فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو چار مختلف عنوانون مین الگ الگ تقسیم کر دیتے ہین، اس لئے ان چار فرضون کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال

اور کامون کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہین،

۱- بندون کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے جسکا عنوان نماز ہے،

۲- وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیئے کرتا ہے، صدقہ اور زکوٰۃ ہے،

۳- خدا کی راہ مین ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیئے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشون کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ مین حائل ہوتی ہین روزہ ہے، یا یون کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے،

۴- دنیاے اسلام مین ملتِ ابراہیمی کی برادری، اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام، اور اس مرکز کی آبادی اور کسبِ روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِ عنوان حج ہے،

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصولِ چارگانہ کے تحت مین داخل ہین، اسی لیے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونون پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا[1] پہلی چیز مین عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور بقیہ چار چیزین ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان،

محیط ہین، انہی ستونون پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے،

اس تقریر کا مفہوم یہ نہین ہے کہ یہ چارون فرض عبادتین نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج اصل مطلوب بالذات نہین ہین، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چارون عبادتین اپنے تمام جزئیات باب، اور محتویات کے ساتھ فرض ہین، جو شخص صرف ان چارون فرائض کو جو عنوانِ باب ہین ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوتہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت ناتمام ہے، اور اُس کے لئے دین و دنیا کی فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، یہین سے یہ شبہہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازین، ہم کو برائیون سے کیون باز نہین رکھتین، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیون نہین بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلون کو پاک و صاف کیون نہین کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہون کی مغفرت کا باعث کیون نہین بنتا، اور قرنِ اول کی طرح ہماری نمازین ملکون کو فتح، اور ہماری زکوٰتین ہمارے قومی افلاس کو دور کیون نہین کرتین، اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیون نہین لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اللہ نے تم مین سے اُن سے جو ایمان
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لائے، اور نیک کام کئے، یہ وعدہ کیا
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ، (نور-۷)	ہے کہ وہ اُن کو زمین مین خلیفہ بنائیگا،

ایمانِ کامل اور اعمالِ نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا، حماقت ہی، اسی طرح ان چارون جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کرکے، صرف مندرجہ تحت

جزئیات کی تعمیل ممکن ہی کہ دنیاے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے، مگر آسمان کی بادشاہت مین اس کو کوئی حصہ نہین ملیگا، اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤن کے پاؤن کے نیچے دونون جہانون کی بادشاہیان رکھدےؔ، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کیساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کے ساتھ اُس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہی،

لہ سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلعم جلد اول ص۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمۃ واحدۃ تعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین بہا العجم،

نماز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے، جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکسان فرض ہے، یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال مین بھی ساقط نہین ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہین ادا کر سکتے تو بیٹھکر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہین ہے، تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منہ سے نہین بول سکتے تو اشارون سے ادا کرو[1]، اگر کسی سخت مجبوری مین رُک کر نہین پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو[2]، سخت خوف کی حالت مین اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف موقع ہو اُسی رخ پڑھو[3]،

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤن سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اُس رحمان و رحیم کی یاد، اور اُس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا، اور اُس کی یکتائی، اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور مین جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بیقرار

[1] نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۸۰ بروایت موقوف از دارقطنی [2] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب [3] صحیح بخاری تفسیر بقرہ آیت صلوٰۃ الخوف

روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل، اور ہستی کا خلاصہ ہے،

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگون ہونا اس کے حضور مین دعا، و فریاد کرنا، اور اس ذکر و شکر مین تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیون مین کوئی ساز ہے، جو نامعلوم انگلیون کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے، قرآن نے جا بجا انسانون کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتین آتی ہین، جب سمندر مین طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور مین پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو،

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے، اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے، اور اپنی دلی تمناؤن کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنون کا علاج ممکن نہین، وحشی سے وحشی مذہب مین بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہین، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہین؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب مین خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہین، اسلام مین اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیون مین مزمور، عیسائیون مین دعا، پارسیون مین زمزمہ، اور ہندوؤن مین بھجن ہین، اور دن رات مین اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک مین بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصول مین سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہین۔ قرآنِ پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا مین کوئی پیغمبر ایسا نہین آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ

دی ہو، اور اس کی تاکید نہ کی ہو خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں اس کی حیثیت[1] سب سے زیادہ نمایاں ہے، حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ" (ابراہیم-۶) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں، کہ "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" "اے میرے پروردگار، مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا" حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے، "وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ" (مریم-۴) "وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے"۔ حضرت شعیبؑ کو اُن کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں "أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا" (ھود-۸) "کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں"۔ حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اُنکی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے، "وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ" (انبیاء-۵) "اور ہم نے اُن کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی"، حضرت لقمانؑ

---

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا، چنانچہ توراۃ اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربانگاہ بنائی اور خدا کا نام لیا، (پیدائش ۱۲-۴) حضرت اسحاقؑ نے خدا کا نام لیا، (پیدائش ۲۶-۲۵) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا، (زبور ۱۱۷-۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے، "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى" (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا پس نماز پڑھی؛ اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفر دانیال وغیرہ، اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اُس کا ترجمہ نماز کیا ہے، (متی ۱۷-۲۱) اور (متی ۲۳-۱۴)

اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہین "یابُنَیَّ اَقِمِ الصَّلوٰۃَ" (لقمان -۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر" حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا "وَاَقِمِ الصَّلوٰۃَ لِذِکْرِیْ" (طٰہٰ -۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر" حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور اُن کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے "وَاَقِیْمُوا الصَّلوٰۃَ" (یونس -۹) اور نماز کھڑی کیا کرو" بنی اسرائیل سے وعدہ تھا "اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلوٰۃَ" (مائدہ -۳) مین تمہارے ساتھ ہون اگر تم نماز کھڑی کیا کرو" حضرت زکریا کی نسبت ہے "وَھُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ" (ال عمران -۴) اور وہ محراب مین کھڑے نماز پڑھ رہے تھے" حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین "وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلوٰۃِ" (مریم -۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے"

آیاتِ بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ مین بھی عرب مین بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے،

مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ	اہل کتاب مین کچھ لوگ ایسے بھی ہین جو
یَتْلُوْنَ اٰیَاتِ اللہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ	راتون کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتین پڑھتے
وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ ۔ (ال عمران -۱۱)	ہین، اور وہ سجدہ کرتے ہین،

حدیث مین بھی یہودیون اور عیسائیون کی نماز کے تذکرے ہین، مثلاً آپ نے فرمایا کہ "جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیون کی طرح (ننگے) نہ پڑھو" (صفحہ ۴۲) "تم یہودیون کی طرح صرف اوپر سے نماز مین چادر مت ڈال لو، بلکہ اس کو باندھ لیا کرو" (صفحہ ۴۳) "نماز مین یہودیون کی طرح مت جھومو" (صفحہ ۱۱۲) "تم یہودیون کے برخلاف نماز مین موزے اور جوتے پہنے رہو" (صفحہ ۱۱۴) "میری امت مین اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہیگا، جب تک لوگ یہودیون

کی تقلید مین مغرب کی نماز مین ستارون کے نکلنے کا اور عیسائیون کی تقلید مین صبح کی نماز مین ستارون کے ڈوبنے کا انتظار نہ کرینگے" (صفحہ) [1] ان حوالون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ مین کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے،

عرب مین جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان مین بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے، کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "اے خدا مجھے معلوم نہین کہ مین تجھے کیسے پوجون" یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اُسی پر سجدہ کر لیتے تھے" [2] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے، جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ حضرت ابو ذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات، اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے اُن سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رُخ کر لیتا [3]، عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے [4]،

وادرکن اعجازاً من اللیل بعدما ۔۔۔ اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(اور ان سوارون نے رات کے پچھلے حصہ مین اس وقت کے بعد جب عبادت گذار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب مین مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات مین نماز ادا کرتے تھے،

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا، اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، اور نماز سے زیادہ انھون نے قربانی اور نذرانون پر زور دیا تھا، جن مین خلوص اور

---

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثین نقل کی گئی ہین، اور متن مین اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیئے گئے ہین، [2] ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل، [3] صحیح مسلم فضائل ابی ذر [4] لسان العرب لفظ حنف،

خداپرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیون نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانون کی نمازین بھی شروع کردی تھین، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سیکڑون ولیون اور شہیدون کی عبادت مین مصروف ہوگئے تھے[1]

دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل و صورت اس قدر مسخ ہوگئی تھی کہ آج بھی اُن کے صحیفون مین اس کی اصلی شکل نظر نہین آتی، نہ ان ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفون کے حامل اور امانتدار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤن کو پڑھتے تھے، اور اس کی ادائگی کے کیا اوقات تھے جو کچھ ان مین رہ گیا تھا، وہ صرف عملی رسم و رواج، اور بعد کے مذہبی مقتداؤن کی کچھ تجویزین، جنپر مذہبی فریضہ سمجھکر عمل کیا جا رہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے، اس کو یہود و نصاریٰ دونون نے مشکل اور باعثِ تکلیف سمجھکر چھوڑ دیا تھا، اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انھون نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید مین اُن کی اس صورتِ حال کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا گیا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	اُن کے بعد اُن کے وہ جانشین ہوئے جنکو
وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ	خدا کی کتاب باپ دادون سے وراثت
هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا	مین ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت ("ورشپ") ۱۲،

وَاِنۡ یَّاۡتِہِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُہٗ
یَاۡخُذُوۡہُ ؕ اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡہِمۡ
مِّیۡثَاقُ الۡکِتٰبِ اَنۡ لَّا یَقُوۡلُوۡا
عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ وَدَرَسُوۡا
مَا فِیۡہِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ
لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ
وَالَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ
اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ۝

(اعراف - ۲۱)

فائدہ لیتے ہین، اور کہتے ہین کہ ہم کو معاف
کردیا جائیگا، اور اگر ایسا ہی فائدہ اب
بھی ان کے سامنے آئے تو لے لین
(اور مذہب کی پروا نہ کرین) کیا ان سے
کتاب کا معاہدہ نہین لیا گیا کہ وہ خدا کے
متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہین گے،
اور ان لوگون نے جو کچھ اس (کتاب)
مین ہے اس کو پڑھا، اور آخرت کا گھر
ان لوگون کے لئے ہے، جو پرہیزگار ہین
کیا تم نہین سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب
کو مضبوطی سے پکڑین، اور انھون نے نماز
کو قائم کیا، تو ہم اپنی حالت درست کرنے والون
کی مزدوری برباد نہین کرتے

سورہ مریم مین تمام انبیاے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے،

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ
اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا
الشَّہَوٰتِ ، (مریم - ۴)

اُن کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے
جنھون نے نماز کو برباد کیا اور اپنی خواہشون
کی پیروی کی،

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود، نماز کو صرف چھوڑ دینا نہین ہے، بلکہ زیادہ تر اُسکی

حقیقت اور اُس کی روح کو گم کر دینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے اونکی نسبت یہ شہادت دی کہ "اُن کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ مین سرشار ہوتے ہین تو وہ اسکو ہنسی کھیل بنا لیتے ہین،

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْهَا	اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو
هُزُوًا وَّلَعِبًا، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہین، یہ اس لئے
قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ، (مائدہ-۹)	کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہین،

اہلِ عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہین کرتے تھے، بتون کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتون کی خوشامد، یہ اُن کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعون پر وہ خدا سے دعائین مانگتے تو اُن مین بھی بتون کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موحدانہ خضوع وخشوع کا اُن کی دعاؤن مین شائبہ تک نہ تھا، مسلمانون کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو اُنکا منھ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ اُن کے متعلق قرآن نے کہا،

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ	اور اُن کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی اور
الْبَیْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِیَةً، (انفال)	تالی بجانا ہے،

اگلے مفسرون نے اس آیتِ پاک کے دو مطلب لئے ہین، ایک یہ کہ واقعی وہ جو نماز

پڑھتے تھے، اس مین سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجاکر اُن کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی اُن کی نماز تھی[1]، پہلے معنی کی بنا پر تو اُن کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو ولعب تھا، اور دوسرے معنی کے روسے سرے سے اُن کے ہان نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسرون کو نماز سے روکنا ہی اُن کی نماز تھی،

ایک اور آیت مین ہے،

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡهٰی عَبۡدًا	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ
اِذَا صَلّٰی، (علق -۱)	کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے،

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحن حرم مین نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی تُعَرض کرتے، کبھی آپ کی گردن مین پھندا ڈال دیتے[2]، اور کبھی جب آپ سجدہ مین جاتے پشت مبارک پر نجاست لاکر ڈالدیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارِ نجاست سے اٹھنے مین تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے[3]، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز مین تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد اُن کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ مین چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً ادھر اودھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے مین اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی اس حالت

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور، [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ، [4] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المراۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی،

مین اُن کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحاق مین ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیون مین چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص چند مسلمانون کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی مین نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانون کو برا بھلا کہا، اور اُن سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی؛[1]

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازین بالعموم اخلاص واثر، سکون و دلجمعی خشوع وخضوع، اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھین، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانون کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے، اور اُن کی عبادتین کرتے تھے، اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی اُن کے ہان شرک کا منظر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنھون نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا، وہ نماز کا تھا، یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (مدثر-۱) اے لحاف مین لپٹے ہوئے اُٹھ، اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول" رب کی بڑائی بولنا" یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی، اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے، آپ نے سونے والون کو جگایا، بھولے ہوؤن

---

[1] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

کو بتایا، انجانون کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے سونے چاندی کے، اور اینٹ اور پتھر کے اُن بتون کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، ڈھکیل کر نیچے گرادیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا مین باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو حرام کردیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا مین ظاہر ہوئی، آپنے اہلِ عرب اور دنیا کی بت پرست قومون کی نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائین تعلیم کین، عیسائیون کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا، یہودیون کو نماز کے خضوع و خشوع، راز و نیاز، اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونون کیساتھ ناقابلِ تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ-۳۱) نمازون کی نگہداشت کرو،

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونون حیثیتون سے نگہداشت کا حکم ہے، اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (انعام-۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہین،

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج-۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (مومنون-۱) اور (کامیاب ہین) وہ جو اپنی نمازون کی نگہداشت کرتے ہین،

خود آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے، کہ خود بھی نماز پڑھو، اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا حکم دو،

اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ مین ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا،

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، (طٰہٰ - ۸)	اور اپنے گھر والون پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے رہو (پابند)

نماز کیسی ہونی چاہئے؟ فرمایا،

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ، (بقرہ - ۳۱)	اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

تعریف کی گئی کہ

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، (مومنون - ۱)	(کامیاب ہین وہ مومن) جو اپنی نماز مین خشوع کرتے ہین،

حکم ہوا کہ

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف - ۷)	تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو،
وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا، (اعراف - ۷)	اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کیساتھ پکارو،
وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، (اعراف - ۳)	اور خدا کو پکارو، اس حال مین کہ تم دین کو اسی کیلئے خالص کرنے والے ہو،

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے،

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لیے اُن کے اندر سے عملاً اُس کی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح، معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ ملہموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی، ورنہ جیسا کہ گذر چکا، قرآن کے رُو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور اس نے اپنی اُمت کو اُس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے، کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں، واضح اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم، واضح، مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے، کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے،

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت[1]، اور اُس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے، وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى (نساء-۲۱) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں، فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، (ماعون-۱)

کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا، اور اُس کی تکمیل اس شبستانِ قدس مین ہوئی جس کو معراج کہتے ہین[۱]،

اسلام مین پہلا فرض ایمان اور اُس کے لوازم ہین، اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) مین پہلا حکم یہ دیا گیا کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھو، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگون کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، (روم-۴)	اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکون مین سے نہ ہوجاؤ،

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک مین گرفتار ہوجانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہین، خود اُس کیفیت کے زائل ہوجانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اُس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے،

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "نماز دین کا ستون ہے" جس طرح ستون گرجانے سے عمارت گرجاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہوجاتی ہے، طائف کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۱) افسوس ہے ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہین،
[۲] کفار کے بارے مین ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (مدثر-۲) ہم نمازیون مین نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہین گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ مین کیون ہو، [۱] کتب صحاح واقعات معراج و اسراء و صحیح بخاری کتاب الصلوۃ،

وفد نے جب مدینہ منورہ آکر صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد، اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پچھلی باتون سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا، "جس دین مین خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو، اُس مین کوئی بھلائی نہین"۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ "نماز دل کی روشنی ہے"، اپنی نسبت فرمایا ہے، "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے"، ایک تمثیل مین آپ نے فرمایا، "انسان آگ مین جلتا رہتا ہے، اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے" یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے، اور نماز آب زلال ہے، جو آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ "کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے" کیونکہ ایمان اور کفر دونون انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہین، جنکا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن مین متعدد دفعہ لوگون کو موقع ملے نماز ہی ہے، عین اس وقت جب جناب رسالت پناہؐ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے "نماز اور غلام"[1]

نماز کی حقیقت

نماز کے لئے اصل عربی لفظ "صلوٰۃ" ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانون مین "دعا" کے ہین، اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اسکی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان مین ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب مین تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس مین شریک تھے

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) مین مختلف کتب حدیث کے حوالون سے درج ہین،

اُن کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھون نے نماز کی حالت مین یرحمک اللہ کہدیا، صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی مین کہا، تم سب مجھے کیون گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ہو چکی تو آنحضرت صلعم نے پوچھا کہ نماز مین کون باتین کرتا تھا، لوگون نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپنے اُن کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ "نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس مین انسانون کو باتین کرنا مناسب نہین[1]"۔ حضرت انسؓ کہتے ہین کہ آپنے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے" اور حضرت نعمانؓ ابن بشیر انصاری روایت کرتے ہین کہ آپنے فرمایا "الدعاء ھو العبادۃ" "دعا ہی عبادت ہے"[2] اس کے بعد آپنے یہ کہکر کہ تمھارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید مین یہ آیت پڑھی جس مین دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے،

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ	مجھ سے دعا مانگو مین قبول کرون گا جو
یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ	لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے
جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ، (مومن - ۶)	ہین، وہ عنقریب جہنم مین ذلیل و خوار ہونگے

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) مین ہے کہ آپنے فرمایا "بہترین عبادت دعا ہے" اس کے بعد آیتِ مذکور تلاوت فرمائی،

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ، یہ دو روایتین ہین، ہم نے ان دونون کو جمع کر دیا ہے، [2] یہ دونون حدیثین جامع ترمذی کتاب الدعوات مین ہین، دوسری حدیث ابو داؤد کتاب الصلوۃ باب الدعاء مین اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء مین بھی ہے،

قرآن پاک مین حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن مین نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ مین ادا کی گئی ہے، یعنی "خدا کی یاد" فرمایا،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ (طٰہٰ-۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

کامیابی اسی کے لئے ہے جو خدا کو یاد کرکے نماز ادا کرتا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۝ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ۝ (اعلیٰ-۱) کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی؛ اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی،

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بےچینی، قلبی اضطراب، اور ذہنی شورش کے عالم مین جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے، تو سکون واطمینان کی راحت اُس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا، اور التجا مین ملتی ہے، وحیِ الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ مین ادا کیا،

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (رعد-۴) ہان! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ مصیبتون کے ہجوم اور تکلیفون کی شدت کے وقت ثباتِ قدم اور دعا ہی چارۂ کار بنتے ہین،

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ، (بقرہ-۵) ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتون مین مدد چاہو،

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرنگون ہے

آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل جھاڑ، چرند، پرند، سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بےچون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی اُن کی تسبیح و نماز ہے

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ	اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں، اگر یہ کہ وہ
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ	(اس خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہو، البتہ
(بنی اسرائیل-۵)	تم اُن کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو،
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ	کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ	اور جو زمین میں ہے، اور سورج، چاند،
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ	تارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت
وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ	سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت
النَّاسِ ؕ وَكَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ	سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا
الْعَذَابُ ؕ (ج-۲)	(کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگوں ہے، لیکن استثنار ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہتیرے اس سے روگردان ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنار اطاعت گذار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ و اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے، اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار

مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہے، جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیون مین خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل مین مصروف ہےنز تو انسان کیون نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض و غایت

نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم، مالک الملک منعم اعظم کی بے غایت بخششون، اور بے پایان احسانون کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کرین، تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ مین سرایت کرجائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت مین اس طرح قائم ہوجائے، کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھون کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھین، جس سے اپنے برے ارادون پر شرمائین، اور ناپاک کامون کو کرتے ہوئے جھجھکین، اور بالآخر ان سے بالکل باز آئین صحیحین کی کتاب الایمان مین ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مجمع مین تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت مین آکر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپنے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہین دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا، کہ "نماز کی حالت مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے، کیونکہ اُس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتون مین مصروف ہوتا ہے"[1]، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب البزاق فی الصلوٰۃ، صحیح مسلم باب المساجد، مسند احمد صفحہ ۳۴ جلد ۳ ص ۱۷۶ و ص ۱۸۸ وغیرہ۔

اعتکاف میں بیٹھے تھے، اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا، "لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ۔"[1] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں، اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ	اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بےحیائی اور
تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط	برائی کی باتوں سے روکتی ہے، اور البتہ
وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط (عنکبوت ۵)	خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے،

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بےحیائیوں سے روکتی ہے، اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے، اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بےحیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے، جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی لا وَذَکَرَ اسْمَ	کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل
رَبِّہٖ فَصَلّٰی ط (اعلیٰ)	کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی

[1] مسند احمد جلد ۲ ص ۳۶ و ص ۶۷ و ص ۱۲۹،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے، یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے،

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ	تو ان ہی کو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے
رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اور
وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ	نماز کھڑی کیا کرتے ہیں، اور جو تزکیہ (دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے
وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ،	ہی لئے حاصل کرتا ہے، اور (آخر)
(فاطر-۳)	خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی، اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا	بے شک انسان بے صبرا بنا ہے، جب
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا	اُس پر مصیبت آئے تو گھبرایا، اور
وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا	جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ لا الَّذِيْنَ هُمْ	وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں)
عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ لا (معارج-۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے،

نماز کے ان ہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ "اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟" "صحابہؓ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ، ارشاد ہوا کہ "نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھوتی ہے جس طرح پانی میل کو"[1] ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ	اور دن کے دونوں کناروں پر اور
وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ	رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا
یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ	کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو
ذِكْرٰی لِلذّٰكِرِیْنَ ،	دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد
(ھود - ۱۰)	رکھنے والوں کو،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیرووں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، اُن کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے،

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (جلد ۴ صفحہ ۶۷ و ۶۸) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی، اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں،

[2] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ و تفسیر سورۂ ہود،

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہین جن کی پابندی اور رعایت ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہین، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جسکو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ "نفسیات" یا "دماغی کیفیات" کہتا ہے، اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہین جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال وافعال سامنے آتے اور اُن کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہین، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسرون کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہین، اور اُن کے مناسب شکل وصورت، اور احوال (گرد و پیش) نہ اختیار کرین، تو ہم کو اُن کے پیدا کرنے مین کامیابی نہین ہوسکتی، ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت مین وضع ہوئے ہین اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم وآداب اور قواعد وضوابط مقرر ہین، معبدون، ہیکلون اور گرجون مین جہان مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریون اور کاہنون کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون و خاموشی ادب ولحاظ، گھنٹون کی پرشکوہ آواز، اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہین، شاہانہ رعب وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسون اور سلطانی دربارون مین فوجون کے پرے، قوی ہیکل چوبدار، عصابردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکین ننگی تلوارین، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور دمبدم دورباش اور نگاہ روبرو کی پررعب صدائین ضروری ہین، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے

کے لئے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی وصفائی، شور و غوغا، اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزین ہین، بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا، اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے،

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال مین بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی، اور خدا کی عظمت و کبریائی، اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار نیز دل و دماغ اور نفس و روح مین پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے، جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو و نما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار مین کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات مین ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہون، ادب سے اس کی بارگاہ مین اپنی دعاؤن اور التجاؤن کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے، اور اس مین روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے، فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز مین کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ مین جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے،

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازون سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازون سے مسجد کی نماز بہتر ہے، کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلون کی کیفیت کو دوبالا کر دے گا، اسی بنا پر تمام

بڑے بڑے کامون مین اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے ماتحت اسکولون کی تنظیم، اور اُن کی درجہ بندی، کھیل مین فریقین کی ہمرنگی وہم لباسی، فوجون مین وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے، اور یکسان اسلحہ اور ہتھیار، اور ہم قدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہی، کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت مین چند اشخاص ایسے ہون جو اصلی کیفیت سے متکیف ہون، اُن کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسرون کو بھی پرکیف بناتی ہے، اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہوکر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہوجاتی ہے، اسی لئے جلسون مین ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی، اور ایک کے رونے سے بہتون کو رونا آجاتا ہے، نفسیاتِ اجتماع مین یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی ونفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے،

ذکر ودعا وتسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرایا جاچکا ہے کہ نماز سے مقصود، خضوع وخشوع، ذکرِ الٰہی، حمد وثنا، اپنے گناہون پر ندامت واستغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہی، یہ تمام باتین درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہین، جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہین ہے، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتون کی دو قسمین کی ہین، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت مین کسی قید وشرط کے بغیر ادا کرسکے، اس کا نام عام تسبیح وتہلیل اور ذکرِ الٰہی ہی، جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے، نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت مین انجام پاسکتی ہی چنانچہ خدا نے فرمایا،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا	پس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے، اور
وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ، (نساء - ۱۵)	لیٹے یاد کرو،

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے صحابۂ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا	جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، (آل عمران - ۲۰)	ہیں،

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی اُن کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے، فرمایا،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا	ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور
بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ،	خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد
(نور - ۵)	سے غافل نہیں کرتے،

نماز متحدہ طریقِ عبادت کا نام ہے

دوسری عبادت وہ ہے، جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کیجائے، اس کا نام نماز ہے پہلا طرزِ عبادت انفرادی چیز ہے، اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے، اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے، کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہوسکے، لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے، اور اسی لئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہوسکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی شخص

ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی، لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہیگی، دوسرے لفظون مین ہم اس کو یون تعبیر کرسکتے ہین کہ عام ذکر وفکر اور تسبیح وتہلیل انفرادی طریقۂ عبادت ہی، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے، اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت مین حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اُس سپاہی کی سی ہے، جو کسی منزل مین اپنی فوج سے جس کے ساتھ اُس کو چلنا تھا، کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

نماز مین نظامِ وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض واحکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے، بلکہ وہ عملی کیفیت ہے، جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے، اسلام کے دوسرے احکام کیطرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ، اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت وکیفیت کو تراوش کرنا چاہیے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل وصورت، آئین وطریق، اور سمت ووقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتین اس کو ایک متحدہ نظام مین ادا نہین کرسکتی تھین، نماز لاکھون کرورون مسلمانون پر جنھون نے دعوتِ محمدی کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان مین سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی

کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر منھ کر کے چاہے ادا کرے، تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا، اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤن سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روے زمین کے لاکھون کرورون مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے،

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے، اور کرورون دلون کو جو کرورون اشباح و اجسام مین ہین، ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اُن سے واحد نظام کے ماتحت، واحد صورت و شکل مین، واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے، اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے،

نماز مین جسمانی حرکات یہ بھی ظاہر ہے، کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اُس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے، غصہ کی حالت مین چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف مین زرد پڑ جاتا ہے، خوشی مین کھل اٹھتا ہے، غم مین سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونون ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے، تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے، تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی، اور خوشامد مقصود ہو تو منھ کے بل گرتا ہے، اور پاؤن پر سر رکھ دیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہین، جو ہر قوم مین تقریباً یکسان رائج ہین، اس تشریح کے بعد اب یہ

سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نماز کی دعائین انسانی طرز بیان مین ادا کی گئی ہین اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت مین رکھے گئے ہین،

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اُس کے جسمانی اعضا ہین، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اُس وقت تک کچھ نہین کہہ سکتا، جب تک اُسکے ہاتھ پاؤن اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کُل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہین کر سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے، جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہین، مگر خود بندون کو ان کی ضرورت ہے، کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونون حیثیتون سے عرض و التجا، اور تذلل و عاجزی کی تصویر بنجائین،

انسان اپنے جسم اور روح دونون کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونون جزء خدا کے احسانات و انعامات سے یکسان گران بار ہین، اس لئے ضرورت ہے، کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونون جھک کر سجدۂ نیاز ادا کرین، غرض یہ وجوہ ہین جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونون کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے، اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب مین نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اُس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقون سے کرتے ہین، کھڑے ہو جاتے ہین، جھک جاتے ہین، زمین پر سر رکھدیتے ہین، نماز کے بھی

تین رکن ہین، چنانچہ آغازِ عالم سے انبیاے کرام علیہم السّلام نے جس نماز کی تعلیم انسانون کو دی، وہ ان ہی تین اجزار سے مرکب تھی، کھڑے ہوجانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھدینا (سجدہ)

ارکانِ نماز

معلوم ہوچکا ہے کہ نماز "ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیم کو جب خدا کے گھر کی تعمیر وتطہیر کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ	اور میرے گھر کو طواف کرنے والون،
وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ،	کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے والون،
(حج - ۴)	اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک وصاف کر،

اس حکم مین نماز کے تینون ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلۂ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، اُن کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي	اے مریم اپنے رب کے حضور مین کھڑے
وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ۔	ہوکر بندگی کر، اور سجدہ کر، اور رکوع
(آل عمران - ۵)	کرنے والون کیساتھ رکوع کر،

اس نمازِ مریمی مین بھی، نماز کے تینون ارکان موجود ہین،

تورات کے حوالون سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ مترجمون نے عبرانی اور یونانی لفظون کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم ورواج کے مطابق کردیئے ہین جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑجاتا ہے، بہرحال عبادت اور تعظیم کے تینون طریقے، حضرت ابراہیم کی شریعت اور اُن کی نسل مین جاری تھے، ذیل مین ہم ان مین سے ہر ایک

کا حوالہ توراۃ کے مجموعہ سے نقل کرتے ہین۔

قیام "پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور مین کھڑا رہا" (پیدایش ۱۸-۲۲)

رکوع "اور (ابراہیم) زمین تک اُن کے آگے جھکا، اور بولا اے خداوند" (پیدایش ۱۸-۲)

سجدہ "اور یہ سُن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی، اور اُن کے دکھون پر نظر کی، انھون نے اپنے سر جھکائے، اور سجدے کئے" (خروج ۴-۳۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا، اور خدا اُس سے ہمکلام ہو کر بولا، (پیدایش ۱۷-۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے نوجوانون سے کہا تم یہان گدھے پاس رہو، مین اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہان تک جاؤن گا، اور سجدہ کرکے پھر تمھارے پاس آؤنگا" (پیدایش ۲۲-۵)

"تب اُس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہو" (پیدایش ۲۴-۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہان اس نے خدا کو سجدہ کیا" (۲ سموئل ۱۵-۳۲)

زبور مین حضرت داؤد خدا تعالی سے کہتے ہین:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرون گا" (زبور ۵-۷)

ان حوالون سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت مین عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینون ارکان موجود تھے، اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل مین دعا و نماز کا ذکر متی ۶-۵ و ۱۶-۲۱ و ۲۶-۳۶ مرقس ۱۴-۳۲ و لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ مین ہے، طریقۂ نماز مین ایک انجیل

ہین ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۴۱) اور دوسری مین (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے، اور بقیہ انجیلون مین خاموشی ہے،

عہدِ بعثت مین یہود و نصاریٰ مین جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہوکر توراۃ یا زبور کی آیتین تلاوت کرتے تھے، اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآنِ پاک کی شہادت ہے،

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	وہ برابر نہین ہین، اہلِ کتاب مین کچھ
اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ	ایسے بھی ہین جو رات کو خدا کی آیتین
اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ	کھڑے ہوکر پڑھتے ہین، اور سجدے
(آل عمران - ۱۲)	کرتے ہین،

روایات مین ہے کہ رکوع مین یہودیون کی طرح دونون ہاتھ جڑے نہ رہین[۱]، اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے،

اسلام کی نماز بھی ان ہی قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہین:-

"اسلامی نماز اپنی ترکیب مین بہت حد تک یہودیون اور عیسائیون کی نماز کے مشابہ ہے[۲]"

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقفِ عام کر دیا، انسانی آمیزشون کو نکال کر بھلائے

[۱] فتح الباری ابن حجر جلد ۲ ص ۲۲۷ مصر، [۲] مضمون صلوٰۃ جلد ۴ ص ۹۶،

ہوئے فرضیون کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر مین حقیقت کی روح پھونک دی، اس مین اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی متواتر تعلیم وعمل سے اس کی ظاہری شکل وصورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کردیا، اس طرح اس نے اُس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا،

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح وتہلیل اور ذکرِ الٰہی کا نام نہین، بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہین رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کے عملِ متواتر کے علاوہ خود قرآنِ پاک سے بھی ثابت ہی، خوف اور جنگ مین نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ	نمازون کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت
الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ،	کرو، اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا	ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو
فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا	(پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ،	اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو
(بقرہ ۲۔۳۱)	بتایا جو تم نہین جانتے تھے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس ذکرِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا، جس کی عملی شکل نماز ہے، اور اسی کی تفصیل سورۂ نساء مین ہے، اسی طرح جنگ کی نماز مین ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد، دوسری رکعت ؎ کے متعلق کہا گیا ہے،

؎ اس کی تشریح مین فقہا کا اختلاف ہی، مین نے یہان وہ لکھا ہی جو میرے نزدیک صحیح ہے،

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو
قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ	تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے، اور پہلوؤن پر
فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے
(نساء -۱۵)	تو نماز کھڑی کرو،

اس آیت مین غور کرنے کی دو باتین ہین، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصّلوٰۃ (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھکر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت مین پوری ہوئی، اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مختصر نماز کو "اقامت صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہین کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل، اور بعض ارکان بھی اس مین موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوتِ قرآن سے جداگانہ ہین، یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن مین ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہین، جو جنگ کی حالت مین کم یا موقوف ہو گئے تھے، اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز مین ان کی بجاآوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ مین یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اُس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے بتایا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام مین نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کیلئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلعم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی، اور صحابہ کو کس طرح کی نماز سکھائی

کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اُس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے، اور دوست
و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے، اور اسلام کے ہر فرقہ مین یکسان طور سے عملاً بلا اختلاف
مسلّم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگون کے لئے قرآنِ پاک سے ان کا ثبوت بہم پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا
ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ مین مؤدب کھڑے ہوتے ہین،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ	نمازون پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر
الْوُسْطٰى ۚ وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ	(خصوصاً) نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے
(بقرہ - ۳۱)	مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہین کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۚ (اعلیٰ - ۱)	اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۚ (مدثر - ۱)	اور اپنے رب کی بڑائی کر،

لفظ اللّٰہُ اکبر جس کی نماز مین بار بار تکرار کیجاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،
اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے، اور اُس سے اپنے گناہون کی بخشش چاہتے ہین،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ	اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار
(طور - ۲)	کی حمد کی تسبیح کر،

پھر قرآن پڑھتے ہین،

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ	قرآن مین سے جتنا ہو سکے پڑھو،
(مزمل - ۲)	

قرآن کی ان آیتون مین خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہین، اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہین، جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ	کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو
اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ	کہکر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہین
وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ، اور نہ
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا	بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر، او
وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ	کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا
يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ	نہین بنایا، اور نہ سلطنت مین کوئی
شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ	اُس کا شریک ہے، اور نہ درماندگی
لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ	کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے
تَكْبِيْرًا ۔ (اسرائیل۔۱۲)	اور اس کی بڑائی کر، بڑی بڑائی،

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ مین بہ تمام وکمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز مین پہلے پڑھتے ہین، اس کے بعد قرآن مین سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے، اس کو پڑھتے ہین، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں،

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۔ (بقرہ۔۵)	اور رکوع کرنے والون کیساتھ رکوع کرو

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہین،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو)

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ	اور سجدہ کرو، اور اپنے رب کی
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ	پرستش کرو، اور نیک کام کرو،
(حج - ۱۰)	تاکہ کامیاب ہو،

ان دونون (رکوع وسجدہ) مین خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہین،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ	تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِ عظیم)
(واقعہ - ۲ - ۳)	کے نام کی تسبیح کر،
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى،	اپنے برتر (ربِ اعلیٰ) کے نام کی
(اعلیٰ - ۱)	تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع مین اور دوسرا سجدے مین ادا ہوتا ہے[1] قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب، سورۂ حج (۴- ذکر ابراہیمؑ) اور آلِ عمران (۵- ذکر مریم) سے، اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے، سورۂ نسار (۱۵- ذکر نمازِ خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے مین گر پڑنا، اس مین خود طبعی اور فطری ترتیب ہی، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے، کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات وجذبات مین گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے، اور جب فرطِ بیخودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود،

جسم (یعنی پاؤن) پر رکھدیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے قرآن نے کہا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، (علق-۱) اور سجدہ کر اور قریب ہوجا،

گویا سجدہ قربتِ الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لئے وہ ہر رکعت مین مکرر ادا کیا جاتا ہے،

نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتون کا حکم دیا گیا ہو، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرنگون کرنے کا حکم ہے مختلف دعاؤن کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح وتحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع وخشوع کا فرمان ہے، رسولؐ پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتون کے احکام یکجا ہوگئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظون مین یون کہہ سکتے ہین، کہ قرآن پاک مین مسلمانون کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأت قرآن، ذکر الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہین، اُن کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس مین یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہین، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری مین ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانون کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا، کہ جو چاہے رکوع کرلے، جو چاہے سجدہ کرلے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر وقرأت پر اکتفا کرلے، اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کرکے اس فرض سے ادا ہوجائے، تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا، اور عجب نہین کہ افراد کی طبعی سستی، اور

سہل انکاری ان پورے احکام کی تعمیل مین مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانون کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جا سکتا، اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اُس سے پیدا ہو کر مسلمانون کو واحد امت بناتی اور بتاتی،

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی[1]، اور رسول نے امت کو سکھایا، اور امت نے نسلاً بعد نسلٍ موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا، اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جس مین ذرا بھی شک و شبہہ نہین، وہ آج تک محفوظ ہے،

نماز کی دعا | نماز کی مختلف حالتون مین اُن حالتون کے مطابق مختلف دعائین پڑھی جاتی ہین، اور پڑھی جا سکتی ہین، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتون کی بیسیون مختلف دعائین مروی ہین، اور ہر مسلمان اُن مین سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کے نماز مین پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت مین پڑھا ہے، اور اُس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہین، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام مین نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے، جو خدا نے بندون کی بولی مین اپنے منہ سے ادا کی،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانون کا

---

[1] مؤطا امام مالک و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ
الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ
عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ
وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝
(فاتحہ - ۱)

پروردگار ہے، رحم والا مہربان ہے
ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک
(ہے) (اے آقا!) ہم تجھی کو پوجتے ہین
اور تجھی سے مدد مانگتے ہین، تو ہم کو سیدھا
راستہ چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل
کیا، اُن کا راستہ نہین جن پر غضب آیا، اور
نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہین یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز مین دہراتا ہے، جس کے بغیر، ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے[1]، یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھون کی تقلید کی آرزو اور برون کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد مین خدا کی پہلی صفت کل جہانون کا پروردگار زبان پر آتی ہے، تو اُس کی تمام قدرتین اور بخششین جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین سب سامنے آجاتی ہین، جہانون کی وسعت کے تخیل سے اُسکی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، سارے جہانون کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن مین آتا ہے، انسان ہون کہ حیوان،

۱؎ جامع ترمذی، قرأت فاتحہ،

چرند ہون کہ پرند، پھر انسانون مین امیر ہون یا غریب، مخدوم ہون یا خادم، بادشاہ ہون یا گدا، کالے ہون یا گورے، عرب ہون یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکسان معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان ورحیم" کہکر پکارنے سے اس کی بے انتہار حمت بے پایان شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیف محبت کا سمندر دل کے کوزہ مین موجین مارنے لگتا ہے، "روز جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور موأخذ سے باخبر اور خدا کے جلال وجبروت سے مرعوب کر دیتا ہے، "ہم تجھی کو پوجتے ہین" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ وبُن سے اکھاڑ دیتے ہین، "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہین" بول کر ہم تمام دنیاوی سہارون اور بھروسون کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے، اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بنجاتے ہین، سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہین، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہین،

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ	کہدے (اے پیغمبر) آؤ مین تم کو پڑھ کر
عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا	سناؤن جو تمھارے رب نے تم پر حرام
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج وَ	کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ
لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ	کرو، مان باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ	کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو،
وَاِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ	ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہین،

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا
تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ
اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، وَلَا تَقْرَبُوْا
مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ج وَاَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ج
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ج وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا
ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ لا وَاَنَّ هٰذَا
صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج

(انعام - ۱۹)

بے حیائی کی باتون کے نزدیک جاؤ،
خواہ وہ ظاہر مین (فحش) ہون یا
باطن مین، جس جان کو خدا نے محترم
کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف
کے ساتھ، یہ وہ باتین ہین جن کا حکم
خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو،
اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ،
لیکن اچھی نیت سے، یہانتک کہ وہ
اپنی قوت کو پہنچ جائے، اور ناپ اور
تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو،
ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا
حکم نہین دیتے، جب تم بات بولو تو انصاف
کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیون نہ ہو، اور
خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتین ہین
جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت
پکڑو، اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ، (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو،

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحیِ محمدی کی اصطلاح مین "صراطِ مستقیم" کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، مان باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیون سے

بچنا، معصوم اور بے گناہ جانون کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول مین ایمانداری، بلا رورعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہین جنکو صراط مستقیم کی مختصر سی ترکیب توصیفی مین ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہین، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہین یہی وہ صفات حسنہ ہین جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے، جن پر اُس کا فضل وانعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہین؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کردی ہے،

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ		اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ	(نساء ۹)	ہین، تو وہ اُن لوگون کے ساتھ ہین،
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ		جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ		نبی، صدیق، شہید، اور صالح لوگ،
وَالصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ		ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے،

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے، جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیا، صدیقین، شہدا، اور صالحین) علی قدر مراتب چل چکے،

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت مین ہم اپنی طرف سے بدعتون کا اضافہ کرین، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دین، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے،

پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہین، جنھون نے دین مین اپنی طرف سے ہزارون باتین اضافہ کر دین، دوسری کا نمونہ یہود ہین، جنھون نے احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا، اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے، مسلمانون کی دعا یہ ہے، کہ الٰہی ہم کو ان دونون غلط راستون سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا، (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤن کی جامع جسم و روح کی نیکیون پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس مین خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا،[1]

"جو نماز مین اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصون مین بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے ہے، اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمد للہ رب العلمین (حمد ہو سارے جہانون کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری ستایش کی" پھر جب وہ الرحمن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے، مالک یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی" اتنا میرا حصہ ہے، اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے، کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" (ہم تجھی کو پوجتے ہین، اور تجھی سے مدد چاہتے ہین) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا"

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۴۲ (مصر)

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اُس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط، اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یوروپین فاضل اے جی وینسنک (A.G.WENSINCK) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"(اسلام کے روسے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پر نقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے، یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع وخشوع کی بھی ضرورت ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جس میں محمدؐ نے کہا ہے، کہ "مجھے تمھاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے" محمدؐ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے، جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ "نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے" اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے، کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"[1]

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور نماز میں پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت	اس دعاے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیا کی منصوص دعاؤں سے

[1] یہ حدیث اوپر گذر چکی،

حضرت موسیٰؑ نے نماز مین جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج مین موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤن کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس مین ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل مین حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب مین حواریون کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہین، جو آج تک عیسائیون کی نماز کا اصلی جزء ہے، ان دعاؤن کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ کی زبانِ وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسنِ تعبیر، جامعیت، پاکیزگی، اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلیگا کہ اسکی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نماز دون مین پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت اُبیؓ سے فرمایا تھا کہ "نماز مین جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی اُمّ القرآن قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ مین اتری نہ انجیل مین نہ زبور مین، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن مین موجود ہے[1]" اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤن پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا،

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب الخروج مین ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہِ طور پر چڑھے، اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ مین گر پڑے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ دعا تعلیم کی،

> خداوند، خداوند، خدا، رحیم، اور مہربان، قہر مین دھیما اور رحمت اور وفا، ہزار پشتون کے لئے فضل رکھنے والا، گناہ، اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا لیکن وہ ہر حال مین معاف نہ کریگا،

[1] جامع ترمذی، فضائلِ سورۂ فاتحہ،

بلکہ باپون کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندون سے اور فرزندون کے فرزندون سے،
تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا۔" (۳۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہین لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہی پہلے
فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر مین باب اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے،

زبور مین حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا، زبور باب ۸۶،

داؤد کی نماز

"اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سُن کہ مین پریشان اور مسکین ہون، میری جان کی حفاظت کر کہ مین دیندار ہون، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکُّل تجھ پر ہے، رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ مین تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہون، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند مین اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہون، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے، اور بخشنے والا ہے، اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہین، وافر ہے،

اے خداوند! میری دعا سُن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، مین اپنے بپت کے دن تجھ کو پکارون گا، کہ تو میری سنیگا، معبودون کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہین، اور تیری صنعتین کہین نہین اے خداوند! ساری قومین جنھین تو نے خلق کیا، آئینگی، اور تیرے آگے سجدہ کرین گی، اور تیرے نام کی بزرگی کرین گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے،

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا، مین تیری سچائی مین چلون گا، میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ مین تیرے نام سے ڈرون، اے خداوند! میرے خدا مین اپنے سارے دل سے تیری ستایش کرون گا، اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کرونگا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے، اور میری رُوح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہی،

اے خدا! مغرورون نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگون کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے، اور انھون نے مجھ کو اپنی آنکھون کے سامنے نہین رکھا، لیکن تو اے خداوند خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا مین بڑھ کر ہے، میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہین، دیکھین اور شرمندہ ہون، کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی"

اس دعا مین بھی وہی خدا کی حمد وصفت اور توحید وعبادت کا ذکر، راہِ راست کی ہدایت کی طلب اور شریرون اور گمراہون سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دُعا نہین بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز مین پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہی،

انجیل مین نماز کی دُعا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریون کو دعا، اور نماز کے آداب بتا کر یہ دُعا تعلیم کرتے ہین،

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے،

تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے، زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمین دے اور ہمارے قرض ہمین معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضدارون کو معاف کرتے ہین اور ہمین آزمایش مین مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے" آمین،

نام کی تقدیس "خدا کی حمد" ہے، "بادشاہت کے آنے" سے مقصود شاید قیامت، اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعاے قرآنی مین مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان مین "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجاے، بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لیجاے، اور "قرض" سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائین جو خدا کی طرف سے انسانون پر عائد ہین، "آزمایش مین نہ پڑنے اور "برائی" سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہین، جو اسلامی دعا کے خاتمہ مین مذکور ہے کہ "نہ اُن کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہین"،

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چارون دعائین جو چار اولوالعزم پیغمبرون کی زبان نبوت سے ادا ہوئین کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہین جو تکمیل دین کے مختلف مدارج مین کسی کو نظر آسکتی ہے، دعاے محمدی تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ مین ایسی عالمگیری ہے، جو ہر وقت اور ہر حالت مین ہر انسان کے دل کی نمایندگی کرسکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے، جو ظاہر بینون کی لغزش کا باعث ہون،

اور خدا کو انسانون سے رحم و کرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہون، نیز وہ خدا کی جمیت علم کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جس مین کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتین جنکا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہین ہو سکتا، (یعنی، ربوبیت، رحمت، اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت مین وہ تمام صفتین داخل ہین، جنکا تعلق پیدائش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے، جس مین اس کی تمام جمالی صفتون کی نیرنگیان ظاہر ہوتی ہین، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتون کا مظہر ہے، اور پوری سورہ دعا کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیون کے لئے درخواست، اور برائیون سے بچنے کی التجا پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستین حد درجہ مؤدبانہ ہین، اوصافِ الٰہی وہی ہین جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہین، دعا مین عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہین ہے، للٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزون کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤن مین کمیت اور کیفیت دونون حیثیتون سے تناسب موجود ہے، یعنی دونون حصون نے مناسبت کیساتھ جگہ گھیری ہے، اور دونون ٹکڑون کے مضامین مین ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت، اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی اصداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پُر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہان مل سکتا ہے؟

نماز کے لئے تعیینِ اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ مین اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہین

ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہین، اب سوال یہ ہے
کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی ؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم
جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اسکی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہین
اس نے نماز کی تعلیم دی، تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہین بلکہ اس لئے کہ انسان
روزانہ مختلف اوقات مین اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت
یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرلے
کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلا ناغہ انجام نہین دے سکتا، اسی لئے ہر منظم، باقاعدہ، اور دوامی عمل
کے لئے اوقات کی تعیین ضروری ہے، اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کامون کے
لئے اختیار کیا ہے، اس مین اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام
کے کرنے کے لئے ۲۴ گھنٹون کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت
سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہانتک کہ دن تمام ہوجاتا ہے، اور آخری گھڑی بھی گذر
جاتی ہے، اور وہ اس کام کو انجام نہین دیتا، لیکن جب کامون کے لئے اوقات متعین ہوجاتے ہین
تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے، اور وہ وقت گذرنے نہین پاتا
کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو
یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے جاتے ہین،

اوقاتِ نماز کے تقرر مین وہ چیز بھی مد نظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصول وحدت
جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہرون، ملکون، اور اقلیمون مین ہزارون

لاکھون اور کرورون کی تعداد مین آباد ہین، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت مین وحدت کا مرقع بنجاتی ہے، کرہ ہوا مین لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت مین لاکھون کرورون انسانون کو ایک ہی وضع مین ایک ہی شکل مین خالق عالم کے سامنے سرنگون پاؤگے، اور جہانتک مطلع ومغرب مین نمایان فرق نہ ہوگا یہی منظر انکھون کے سامنے رہیگا، مختلف ملکون مین طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہین ہونے دیتا، تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت مین ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اسی حالت مین ہوتا ہے، تو نماز کا فرض اس وقت وہان ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت مین نظر نہین آسکتے تھے،

نماز کے اوقات دوسرے مذہبون مین

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعیین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبون نے یکسان تسلیم کیا ہے، اور اپنے اپنے نظریون اور اصولون کے مطابق عبادتون کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہین، ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہین، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خوان ہوتے ہین، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہین، یہودیون مین تین وقت کی نمازین ہین، جنکو تفلا کہتے ہین، دانیال نبی کی کتاب مین ہے،

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوگئے تو وہ اپنے گھر آیا، اور اپنی کوٹھری کا

دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گذاری (حمد) کرتا رہا۔ . . . . . . پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔" (۶-۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے،

"پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچائے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کرونگا، اور نالہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لیگا۔" (۵۵-۱۶ و ۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے،

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے، ایک تمثیل کہی۔" (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے، اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے،

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا۔" (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے،

"پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے۔" (اعمال ۳-۱)

یونانی مین تیسرے پہر کے بجائے "نوین گھڑی" کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہین، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳۰ مین بھی ہے،

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپنے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے؛

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردون مین سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردون کو سکھایا، اس نے اُن سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو. . . . . اُس نے اُن سے کہا تم مین سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اسکے پاس آکے کہے اے دوست مجھے تین روٹی اُدھار دے" (لوقا-۱۱)

اس تمثیل مین حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انھین گرفتار کیا گیا، وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نمازِ تہجد مین مصروف تھے، (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل مین موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت مین ہے "اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اُٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ مین گیا اور وہان دعا مانگی" بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی نسخے ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام دوامًا اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس مین اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے، وفی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلّی ھناک، یعنی وہ وہان نماز پڑھا کرتے تھے،

۱؎ مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء ۲؎ مطبوعہ مطبعہ ادبیہ بیروت ۱۸۹۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء،

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابون مین مذکور ہین ہم جمع کر لین تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائین گے جن مین سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶ و ۱۷) مین صبح کا مرقس (۱-۳۵) مین، عصر کا اعمال (۳-۱ و ۱۰-۳ و ۳۰) مین ہے اور عشا، رات کی نماز کا لوقا (۱۱ و ۲۲-۳۹) مین!

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتون کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز مین مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتون کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کیلئے چند مناسب اوقات مقرر کر دیئے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کامون مین اپنی عمر کے ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر رستا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے، اور اُس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل مین دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازون کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی مین محسوب ہون، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیَّ علی الصّلاۃ کا نغمۂ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانون کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزون ہے، کہ کتابِ زندگی مین حیاتِ امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت

کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے، کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا
نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے، اور دوپہر تک اس مین مصروف
رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کرکے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے
اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے، کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہوگیا، پھر سہ پہر
کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کرکے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہین
تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے، جو دنیا کے انقلاب
کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کامون کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا
ہے، اس لئے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان
اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہی کہ وہ خدا کا نام لیکر
اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھون
کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے
رہتے ہین،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہین، اسی لئے صبح سے زوال
تک کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہین ہے
یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزون ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ
اوقات تمامتر انسان کے کام کے ہین ان ہی کام کے اوقات کے شروع مین نماز پنجگانہ
مقرر ہوئی ہے،

اسلامی اوقاتِ نماز مین ایک نکتہ

اوقاتِ نماز کی تعیین مین اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ انسانون کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کیجاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قومون مین آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیمروز کو فتح کرکے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب مین اپنا چہرہ چھپالیتا ہے،

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا[1]، حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی مین نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستون کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہین، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبانِ حال سے شہادت دین کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اُس خدائے برحق کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس مین بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی مین تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی

[1] قرآن پاک سورۂ انعام - ۹ -

کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم مین روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچکر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہین، جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہین، جب آنکھون کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہین، اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہین، آفتاب کے ان تینون اوقاتِ انحطاط مین ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر مین مدفون ہو جاتا ہے، اس وقت عشا کی نماز ادا کی جاتی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین نماز کے اوقات کے ذکر مین آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ	نماز کھڑی کر، آفتاب کے انحطاط کے وقت
اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ	رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب،
الْفَجْرِ، (اسرائیل-۹)	عشاء) اور فجر کی نماز،

(تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام مین کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہین رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازین آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات مین ہین، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام مین آفتاب نکلتے وقت اس کے عروج وکمال کے وقت، اور اس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستون کی عبادت کے خاص اوقات ہین،[1]

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا،

اسلام مین طریق و اوقاتِ نماز،	نماز کس طرح اور کن کن اوقات مین اور کے کے رکعتین کر کے پڑھنی چاہیئے، اور اس کے کیا کیا آداب و شرائط ہین، ان سب کے لئے قرآنِ پاک مین ایک

جامع آیت ہی، جو لڑائی کی حالت مین نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ مین مذکور ہے،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ	نمازون پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو،
الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ	اور اللہ کے لئے (نماز مین) ادب سے
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا	کھڑے ہو، پھر اگر (دشمنون کا) خوف
فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ	ہو تو پیادہ ہو کر، یا سوار ہو کر (نماز پڑھو)
كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا	پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو
تَعْلَمُوْنَ ۝	اس طرح یاد کرو، جس طرح اس نے
(بقرہ-۳۱)	تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے،

اس آیتِ پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے، کہ ان باتون کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات مین اور کتنی رکعتون کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآنِ پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنتِ نبوی ؐ کے ذریعہ احادیث مین تحریرًا، اور مسلمانون کے نسلًا بعد نسلٍ متفقہ تواترِ عمل مین عملًا موجود ہے، اور قرآنِ پاک مین اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہین،

نمازون کی پابندی و نگرانی	اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازون کو پابندی سے ادا کرین، ان کی نگہداشت رکھین اور ان پر مداومت کرین، قرآنِ پاک مین نماز کی

پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لئے ایک خاص لفظ "محافظت" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہین، اور جس کی وسعت مین پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا، اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہین، فرمایا،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ، (بقرہ-۳۱)	نمازون کی نگرانی رکھو،
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (معارج-۱)	اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین،
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (مومنین-۱)	اور جو لوگ اپنی نمازون کی نگرانی رکھتے ہین،
وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، (انعام-۱۱)	اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین،

ایک آیت مین یہ بھی فرمایا،

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ، (معارج-۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

ان آیتون سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال مین معاف نہین ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے،

نماز کے اوقات مقرر ہین اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہین، ارشاد ہے،

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	بے شبہہ نماز مسلمانون پر مقررہ اوقات

كِتَابًا مَّوْقُوتًا. (نساء - ۱۵۰) مین فرض ہے،

اس آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازون کے لئے اوقات مخصوص ہین،

وہ اوقات کیا ہین | اداے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہین، صلوٰۃ یا اقامت صلوٰۃ، تسبیح، اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامت صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یاد الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث مین بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہین، اور اشعارِ عرب[۲] و لغتِ عرب[۳] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن مین جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہو گی تو اس سے کسی شبہہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہین ہو سکتی، کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام مین نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہین ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہان تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے،

اس تمہید کے بعد حسبِ ذیل آیتون پر نظر کرنی چاہئے،

۱- قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِّصْفَهُ ۱- رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی

أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا دے،

---

[۱] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الضحیٰ، ما رأیت رسول اللہ صلعم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط، وانی لاسبحہا نیز صحیح مسلم باب جواز النافلۃ علی الدابۃ و باب وکنت اسبح فقام قبل ان اقضی سبحتی،

[۲] اعشیٰ وائل کا شعر ہے:-

وسبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا

(شعر الجاہلیۃ جلد ۳ صفحہ ۳۶۵) [۳] لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۳۱۱، مصر

عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا، (مزمل-۱) اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ،

۲- وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡكَارِ، (المومن-۶)	۲- اور اپنے پروردگار کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر،
۳- وَسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا، (احزاب-۶)	۳- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو،
۴- وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا، (فتح-۱)	۴- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو،
۵- وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ فِیۡ نَفۡسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيۡفَةً وَّدُوۡنَ الۡجَهۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ وَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِيۡنَ، (اعراف-۲۴)	۵- اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر، اور پست آواز میں صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر، اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو،
۶ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِیِّ (انعام-۶)	۶- اور (اے رسول) ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں،
۷- فِیۡ بُيُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَيُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ،	۷- ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے، اور اس کا کہ ان میں خدا کا نام لیا جائے، اور ان میں وہ لوگ

رِجَالٌ، الآیۃ	جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہین
(نور - ۵)	کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان
۸- وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ	۸- اور تو (اے رسول) اپنے کو ان
یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ	لوگون کے ساتھ روکے رہ جو اپنے
وَالْعَشِیِّ ۔ (کھف - ۴)	پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت
۹- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ	۹- اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی
تَقُوْمُ وَمِنَ اللَّیْلِ فَسَبِّحْہُ	بیان کر، جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے
وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۔	کچھ حصہ مین اس کی تسبیح کر اور ستارون
(طور - ۲)	کے پیٹھ پھیرتے وقت،
۱۰- وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ	۱۰- اور نماز قائم کر دن کے دونون
وَزُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ ۔ (ھود - ۱۰)	کنارون مین اور رات کے کچھ ٹکڑون مین
۱۱- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ	۱۱- نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت
اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ	رات کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا	پڑھنا بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے
وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً	اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز
لَّکَ ۔ (اسرائیل - ۹)	پڑھ، (تہجد)
۱۲- وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّ	۱۲- اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر،

أَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ	صبح کو، سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ
وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا، (دھر-۲)	کر اور بڑی رات تک اسکی تسبیح کر،
۱۳- فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ	۱۳- کافرون کے کہے پر صبر کر، اور اپنے
سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ	پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ	سے پہلے، اور اس کے ڈوبنے سے پہلے،
آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ	اور رات کے کچھ حصون مین اس کی تسبیح
لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ، (طٰہٰ-۸)	پڑھ، اور دن کے کنارون مین، تاکہ تو خوش ہو۔
۱۴- فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ	۱۴- تو خدا کی تسبیح پڑھو جب شام کرو اور
وَحِينَ تُصْبِحُونَ، وَلَهُ الْحَمْدُ	جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانون اور
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا	زمین مین، اور سہ پہر کو، اور جب تم دوپہر
وَحِينَ تُظْهِرُونَ، (روم-۲)	کرو،
۱۵- فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ	۱۵- تو ان کافرون کے کہے پر صبر کر، اور
بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے
وَقَبْلَ الْغُرُوبِ، وَمِنَ اللَّيْلِ	سے پہلے، اور ڈوبنے سے پہلے، اور کچھ
فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ، (ق-۳)	رات مین تسبیح پڑھ، اور ڈوبنے کے بعد[1]
۱۶- مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ	۱۶- فجر کی نماز سے پہلے، اور جب دوپہر

[1] جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا، "سجدہ کے بعد" اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازون کے بعد کی تسبیح وتہلیل مراد لی ہے،

تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ — کی گرمی کے سبب کپڑے اتارتے ہو،

وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ، (نور — ۸) — اور عشاء کی نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں، اور بعض نہیں، مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں، جنہیں رسول اللہ صلعم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ اور اُس وقت سے لیکر آج تک تمام رُوے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں، اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہیں، غدو، غداة، بکرہ، فجر، قبل طلوع الشمس، اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی اور قبل غروب شمس سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تُمسُونَ (جب شام کرو) سے مراد مغرب، اور من آناءِ اللیل (کچھ رات گذرے) غسق اللیل (رات کی ابتدائی) تاریکی، اور صلوٰة العشاء سے مقصود عشا کی نماز ہے، اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں، جنہیں خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے،

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے، کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ مین دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہین ادھر اودھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورہ مزمل مین جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتون مین ہے، یہ آیتین آئی ہین،

يَآيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۭ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ (مزمل-۱)	اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ، اور اس مین قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہین (یعنی شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہین) بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے مین طمانیت قلب کے زیادہ موقع ہے

[illegible]

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ، (شعراء ۔ ۱۱) (اپنے قریب کے اہلِ خاندان کو ہشیار کرو) کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہین یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ،	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ، جو
الَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ،	تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو
وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ،	(نماز کے لئے) اٹھتا ہے، اور نمازیون
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ،	مین تیرا پھرنا دیکھتا ہے، بیشک وہی
(شعراء ۔ ۱۱)	سنتا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم ان دشمنون کے بیچ مین راتون کو اٹھکر خود نماز پڑھتے تھے، اور مسلمانون کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز مین مصروف ہے، اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پرخطر حالت مین آپ کا راتون کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب جب اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشا) اور تارون کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ	اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بیشک
بِاَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ	تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے، اور

حِیْنَ تَقُوْمُ o وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ	اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو
وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ o	نماز کو کھڑا ہو، اور کچھ رات کے حصہ مین
(طور - ۲)	اُس کی تسبیح کر، اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت،

یہ آیت سورۂ طور کے آخر مین ہے، اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ مین نازل ہوئی تھی[1]، اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلعم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ مین اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب، اور اُن پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازون کی تفریق ہے، سورۂ دہر مین جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالبًا سورۂ طور کے بعد اتری ہی، اِن ہی معنون کی ایک اور آیت ہے، جس مین ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ	تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر،
مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا، وَاذْكُرِ اسْمَ	اور ان مخالفون مین سے کسی گنہگار یا اللہ
رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا،	کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان، اور صبح کو
وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ	اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام
سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا،	لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور
(دہر - ۲)	رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر،

[1] صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن مطعم،

اب رات کی دیر تک کی نمازِ تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب، مگر ہنوز "اصیل"[1] میں ظہر و عصر اور من الّیل (رات) میں مغرب اور عشا کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو، اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیساکہ آیت بالاسے ظاہر ہے،

اب یہ ان تین وقتوں کی "تسبیح و تحمید" باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے، حکم ہوتا ہے،

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ	دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر
زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ، (ھود-۱۰)	اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں (یعنی مغرب)

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں اکثر انبیاء علیہم السّلام کے متعلق یہ بیان کرکے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالبًا نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں "تسبیح" کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی، جیساکہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

---

[1] "اصیل" دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں جو عصر کے لئے سورۂ روم میں استعمال ہوا ہے، [2] طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے، قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا، بالعشی والابکار، بالغدو والاصال، اس میں پہلا طرف فجر، بکرۃ، اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے،

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا،

(هود--۱۰۰)

پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے،، اور وہ جنھون نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلین) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو،

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازین باقاعدہ فرض ہوتی ہین، ایک دن کے ایک کنارہ مین یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے مین دن کے خاتمہ کے قریب،، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ مین، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازون مین اجمال اور ابہام تھا، دوسری مین ظہر و عصر، اور تیسری مین مغرب و عشا کی نمازین چھپی ہوئی تھین، اب رات کی نمازین سب سے پہلے علحدہ ہوتی ہین، سورۂ قٓ مین جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے،

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ

پس ان (مخالفون) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اسکے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے پر (عشاء کی) تسبیح کر، اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے کے بعد (یعنی مغرب کے بعد نفلیں پڑھ)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے، اس آیت پاک مین رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشا کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا وَمِنَ اللَّيْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ مین رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتہً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل، اور پھر طرفی النہار (دن کے دونون کنارون مین) اور یہان قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے، ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونون نمازین داخل ہین، چنانچہ سورہ روم مین جو مکہ مین نازل ہوئی ہے، اس کی تفصیل کیگئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیون کی شکست کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچوین چھٹے سال سے لیکر آٹھوین نوین سال تک ہے،

(حاشیہ صفحہ ۱۲۸) لہ آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہی اس لئے ادبار السجود سے ادبار سجود الشمس مراد ہی، جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہی، آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہی، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث مین ہی، کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کیلئے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا، سجود اصل مین زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہین، اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہی، اس طرز ادا سے آفتاب پرستون کی تردید مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا، کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ مین ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیرون مین حضرت علیؓ سے روایتین ہین، کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتین ہین،

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ	اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یارات) کرو، اور
حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۔ وَلَہُ الْحَمْدُ	جب صبح کرو، اور اُس کی حمد آسمانوں او
فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا	زمین مین ہے، اور آخیر دن کو اُس کی
وَّحِیْنَ تُظْہِرُوْنَ ۔ (روم-۲)	تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو،

اس آیت پاک مین زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازون کی توضیح کیگئی ہے، ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتون کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر، طٰہٰ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور مین ظہر کا بالاجمال، دہر، ق، طٰہٰ اور اسرا مین اور بالتصریح اسراء، اور روم مین، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق، اور روم مین مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ، اور روم مین اور بالتصریح ق مین، عشا کا بصورت صلاۃ اللیل، مزمل، طور و دہر مین، اور بصورت عشاء بالاجمال طٰہٰ، ہود، اور روم مین اور بالتصریح ق اور ہود مین ہے، تمام نمازون کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسراء، اور طٰہٰ مین ہی، طور سے فجر اور عشاء، دو وقتون کی نماز، اسراء ہو، اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتون کی، روم سے چار وقتون کی (اگر مسا سے صرف مغرب مراد لین) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتون کی نماز ثابت ہی،

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین

اوپر کی آیتون پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتون مین ظہر اور عصر کی نمازین مجمل ہین، یعنی دونون کو ایک نفظ "قَبْلَ الْغُرُوْبِ" یا "اِتِّصَلَ

یا طرفُ النّھار کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، آخری آیت مین جو سورۂ روم کی ہے، ظہر وعصر کی نمازون کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نمازین اجمال ہے یعنی مغرب وعشا دونون کو حِیْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کردیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونون مل کر ایک بھی ہین اور علحدہ بھی ہین، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملاکر بھی ادا کرسکتے ہین[1]، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت مین ہمیشہ علحدہ ذکر کیگئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہین ہے، احادیث مین جمع بین الصّلوٰتین کے عنوان

---

[1] موطا امام مالک، مسلم، ترمذی باب القصر فی الصلوٰۃ فی السفر والحضر، بعض مستشرقین کو جمع بین الصّلوٰتین کی حدثین دیکھ کر یہ شبہہ پیدا ہوا ہے، کہ زمانۂ نبوی مین شاید تین وقت کی نمازین ادا ہوتی تھین، (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین فاضل وینسک کو بھی یہی شبہہ ہوا ہے، دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہین ہے، بلکہ نمازین ہمیشہ پانچ وقتون کی ہوتی تھین، البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ، اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے، رکعتین اتنی ہی رہتی تھین صرف وقت مین کمی ہوجاتی تھی، فقہا مین باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازون کو یکجا کن صورتون مین پڑھا جاسکتا ہے احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف دو موقعون پر ہے، اور دونون حج مین، ایک عرفات مین ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونون ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہین، کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤن کے لئے ہے، اور دوسرے اسی تاریخ کو مزدلفہ مین مغرب اور عشاء دونون عشاء کے وقت ایک ساتھ ادا کیجاتی ہین کیونکہ مغرب کا وقت عرفات سے مزدلفہ تک آنے مین عموماً گذرجاتا ہے بقیہ نمازون مین حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجائی نہین، بلکہ محض صورۃً دو دو نمازین ایک ساتھ ادا کیجاسکتی ہین، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اوّل وقت مین پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر مین حقیقۃً دو نمازین یکجا ایک وقت مین پڑھی جاسکتی ہین، اور آنحضرت صلعم نے ایسا کیا ہے، شیعون مین ظہر وعصر ایک ساتھ اور مغرب وعشاء ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے،

سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں،

اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلاۃ اسی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے، سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی
إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ	تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر،
إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (اسراء ۔ ۹)	بے شک فجر کی قرارت میں حضور ہوتی ہے

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین، اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس میں سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے، دلوک کے اصلی معنی "جھکنے" اور "مائل ہونے" کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے، زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر، اور غروب پر، اور جب آیتِ مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر

نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات، یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطۂ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے، اور تیسرا دائرۂ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح "دلوک" کے نقطے کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت "غسق الیل" (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشا کی نماز ہے، اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیئے، جب آفتاب کا چہرۂ نورانی زیر تو حجاباتِ ظلمت میں چھپ جاتا ہے، لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے، اور پانچویں نماز کا وقت "قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کیجاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں، بتری ظاہر کرے، غرض اس آیتِ پاک سے اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلامِ عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلامِ عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقاتِ پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق | مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت، اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہلِ لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں، یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا، اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے،

ودلکت الشمسُ تدلك دلوکاً غربت	آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا، اور
وقیل اصفرت ومالت للغروب	کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا
وفی التنزیل العزیز "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ	اور غروب کے لئے جھک گیا، اور قرآن میں ہے کہ
لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ"	"دلوکِ شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز
وقد دلکت زالت عن کبد	کھڑی کرو" اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ
السّماء ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا۔۔۔۔
وقال الفراء عن ابن عباس فی	اور فراء نے کہا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے
دلوک الشمس انہ زوالھا الظہر	کہ دلوکِ شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب
قال ورأیت العرب یذھبون	کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے
بالدلوک الی غیاب الشمس قال	اہلِ عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب
الشاعر،	مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے،
؎ ھذا مقام قدمی رباحِ ؎	"یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں
؎ ذبّب حتی دلکت براحِ ؎	قدم جمے تھے اس نے دشمنوں کو اپنی عزت کی"

[illegible]

يعني الشمس، قال ابو منصور وقد	ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعودؓ سے روایت
روينا عن ابن مسعود انه قال	کی ہے، کہ "دلوکِ شمس آفتاب کا غروب ہے"
دلوك الشمس غروبها وروى	اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ
ابن هانئ عن الاخفش انه	"دلوکِ شمس زوال سے غروب تک ہے"
قال، دلوك الشمس من زوالها	اور زجاج نے کہا کہ "دلوکِ شمس ظہر کے
الى غروبها، وقال الزجاج	وقت آفتاب کا زوال ہے، اور اس کے
دلوك الشمس زوالها في	معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہین، اور
وقت الظهر، وذالك ميلها	یہ بھی اس کا دلوک ہے" محاورہ مین
للغروب وهو دلوكها ايضاً	کہا جاتا ہے کہ دلکت براح وبراحِ
يقال دلكت براح وبراحِ اي	یعنی آفتاب زوال کے لئے جھک
قد مالت للزوال حتى كاد	گیا، یہان تک کہ دیکھنے والا جب
الناظر يحتاج اذا تبصرها	اس کو دیکھنا چاہے تو اس کی کرن کی
ان يكسر الشعاع عن بصره	شدت کو توڑنے کے لئے اس کو آنکھ پر
براحته	ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو۔ .. ..
.. .. فان قيل	.. .. .. تو اگر کہا جائے کہ عرب
ما معنى الدلوك في كلامهم	کے محاورہ مین دلوک کے کیا معنی ہین؟ تو
العرب قيل الدلوك الزوالُ	جواب دیا جائیگا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہین

ولذالك قيل للشمس اذا	اور اسی لئے آفتاب کو "دالکہ" کہتے ہین،
زالت نصف النهار دالكة	جب وہ دوپہر کو جھک جائے، اور
وقيل لها اذا افلت دالكة	جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی
لانها في الحالتين زائلة	اس کو "دالکہ" کہتے ہین، کیونکہ ان دونون
.. ..	حالتون مین وہ جھک جاتا ہے .. ..
.. .. .. قال الفراء في	فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) مین
قوله براح جمع راحة وهي	جو براح کا لفظ ہے، یہ راحہ کی جمع ہے جسکے
الكف يقول يضع كفه على	معنی ہتھیلی کے ہین، کہنے والے کا مطلب ہے کہ
عينيه ينظر هل غربت الشمس	وہ دونون آنکھون پر ہتھیلی رکھکر دیکھتا ہے کہ
بعد ،	آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہین،

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجانے کے وقت آنکھون پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج[1] کہتا ہے،

والشمس قد كادت تكون دنفا   ادفعها بالراح كي تزحلفا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہوکر دُبلا ہو جائے، مین اسکو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے،

اس دوسرے شعر سے، پہلے شعر کے معنی کھُل جاتے ہین، کہ اس مین دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھون کے سامنے آجاتا ہے،

[1] یہ شعر تفسیر طبری مین آیت مذکورہ کے تحت مین، اور لسان العرب مین دنف اور زحلف کے تحت مین مذکور ہے،

اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دُلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب کی طرف چلنے والون کی آنکھون کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعون کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھون کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمتِ افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہین بعض اہلِ لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہدیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہین، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمتِ نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمتِ افق سے ہوتا ہے، اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹون کے بعد آتے ہین اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے، کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر،

سے مراد تین نمازین ہین، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہین، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے[1]، اس کے بعد غسق الّیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی

[1] تفسیرون مین بھی صحابہ کی روایتون سے ان ہی نمازون کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعودؓ

قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشأ اور فجر کی نمازین مراد ہین، اس طرح اس آیتِ پاک سے جو سورۂ اسراء مین واقع ہی، اوقاتِ پنجگانہ مین اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے،

اوقاتِ نماز کا ایک اہم راز

اس آیتِ کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلانِ اولِ آفتاب) سے ہوتا ہے، اور یہی اُس حدیث سے بھی ثابت ہی جس مین بذریعۂ جبریلؑ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہی[1]، اس مین پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر بہ ترتیب اور چارون نمازون کا، ظہر کے بعد، عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشا، یہ چار نمازین تقریبًا دو تین گھنٹون کے فاصلہ سے ہین، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشا سے تقریبًا سات آٹھ گھنٹون کا فصل رکھتی ہی اور پھر صبح سے ظہر تک تقریبًا اسی قدر فصل ہے، چنانچہ اس آیت مین ظہر سے عشا تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہانتک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب، اور مغرب سے عشا تک مسلسل نمازین ہین، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اُٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے، اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہی، جو صبح سے ظہر تک ہی، اور اس مین کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی ہی،

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورۂ اسرار کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ مین بھی ایک آیت ہی جس مین اوقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباسؓ زوالِ آفتاب مراد لیتے ہین، اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہین، اور فیصلہ یہ کرتے ہین کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہی، اور اس طرح اُن کے نزدیک بھی یہ آیت اوقاتِ پنجگانہ کو بتاتی ہے،

[1] سیرت ابن ہشام باب ابتدار فرضیتِ صلوٰۃ،

پنجگانہ کی تفصیل ہی، وہ یہ ہی،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ	اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب
الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ	نکلنے سے پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے
آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ	سے پہلے اور رات کے کچھ وقت مین
النَّهَارِ، (طٰہٰ-۸)	تسبیح پڑھ، اور دن کے کنارون مین،

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشا مراد ہی، اور دن کے کنارون مین ظہر اور مغرب ہے،

اطراف النہار کی تحقیق یہ شبہہ کیا جاسکتا ہے کہ "اطراف" کا لفظ جمع ہی، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہی، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئین، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہین صبح اور شام، یا تین ہین، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے، یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لیجائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے، اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کیجائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہی،

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہی مگر کلام عرب مین تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید مین اس کے استعمالات موجود ہین، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین "دو مشرق" اور "دو مغرب" ہی دوسری جگہ ان ہی کو "مشارق" اور "مغارب" کہا گیا ہے، سورۂ تحریم مین ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تم دونون کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیون کے دو قلب ہونگے، قلوب (بصیغۂ جمع) نہین ہو سکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے

اس مین قیاس اور عقلیت کو دخل نہین اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہین، یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصّے ہین، ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے ان ہی دونون حصّون کے آخری کنارے یہان مراد ہین، صبح سے دوپہر تک کے حصّہ کا آخری کنارہ ظہر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصّہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہی لیکن چونکہ عصر کا ذکر قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لیے متعین ہو گیا کہ یہان اس سے مراد مغرب ہے۔[1]

ایک اور طریقۂ ثبوت اگر ہم قرآن پاک کی علحدہ علحدہ آیتون سے اوقاتِ پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہین تو کر سکتے ہین، مثلاً

۱- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ (اسراء ۹) زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر،

یہ ظہر کی نماز ہے،

۲- وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ، (ق-۳) اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر،

وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ بُکۡرَۃً وَّاَصِیۡلًا (دھر ۲) اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو،

یہ عصر کی نماز ہوئی، اور اسی کو وَالصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی (بقرہ-۳۱) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ مین اس لئے کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازون مین ظہر اور مغرب کے بیچ مین واقع ہی،

۳- وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ، (هود-۱۰) اور دن کے دونون (ابتدائی اور انتہائی) کنارون مین نماز کھڑی کر،

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہی،

---

[1] الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری و لسان العرب)،

۴۔ سورۂ نور میں ہے، کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو،

مِن قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ (نور ۸) صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے،

۵۔ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ، اور عشا کی نماز کے بعد،

اس کے رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نمازِ عشا کا عملی ثبوت ہے، اور یہی پانچوں اوقات نماز ہیں،

نماز پنجگانہ احادیث وسنت میں

تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت صلعم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی، اور خود عمل فرما کر، اور اپنے تمام پیرووں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلعم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرما دی، اور ان میں سے ہر چیز ناقابلِ شک قولی و عملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے، کس وقت کی نماز کی کے رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی، صحابہؓ کو تلقین کی، اور عہدِ نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں

متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ، تمام جماعتِ مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہانتک کہ مرض الموت مین بھی اس مین تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجدِ نبوی اور تمام اسلامی مسجدون مین پنجوقتہ اعلانِ نماز کی اذانین بلند ہوئین، اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہان اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپکے بعد تمام خلفاے راشدین اور تمام پیروانِ محمدی جہان بھی رہے، اور جہان بھی پہنچے، اسی طرح دن مین پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر مین تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر، علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز مین کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار، اور یہ تاکید بلیغ، اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبرون کا طریق عبادت بعد کے پیروون کے ترکِ عمل سے مشتبہ اور عدمِ صحتِ نقل سے مشکوک ہوگیا، خاتم الانبیاء کی شریعتِ آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیونکہ اگر اب اس شریعت مین شک پڑجاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی مین آپکی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایتہً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہین، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعتِ سعید مین دیا، جب آنحضرت صلعم معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے، حکم ہوا کہ شب و روز مین پانچ نمازین تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئین جو پچاس[1] نمازون کے حکم مین ہین، قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا، (انعام - ۲۰) یعنی جو ایک نیکی کریگا، اس کو دس گنا

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ، کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء،

ثواب ملیگا، اس لیے پانچ نمازین یقیناً پچاس[۱] کے حکم مین ہین،

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقاتِ خمسہ[۲] کی تعلیم کی، اور ہر وقت کی ابتدا، اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی[۳]، اور وہی آپ نے اپنے پیروون کو بتایا، اور اس پر اُن سے عمل کرایا،

چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کرکے آیا تھا، خدمت اقدس مین آکر عرض کی یا رسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات مین پانچ نمازین فرض ہین، کیا یہ سچ ہے، فرمایا ہان سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہان[۴]!

خود آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریل اترے اور انھون نے میری امامت کی، تو مین نے اُن کے ساتھ نماز پڑھی[۱]، پھر پڑھی[۲]، پھر پڑھی[۳]، پھر پڑھی[۴]، پھر پڑھی[۵]، یہ فقرے منھ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک، دو، تین، چار، پانچ گنتے جاتے تھے[۵]، ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو، اور وہ اس مین دن مین پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہین نہین رہیگا، فرمایا تو یہی مثال پانچون وقت کی نمازون کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہون کو دھو دیتا ہے[۶]، اوقات کی

---

[۱] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس [۲] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ص۱۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص۲۴ و ۲۵ مصر، [۳] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا باب اوقات الصلوٰۃ الخمس، [۴] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

تیسین مین فرمایا، کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اسکا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے، کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو، تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشا پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے[1]۔

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہین کہ حضور صبح کی نماز مین ساٹھ سے سو آیتین تک قرأت کرتے تھے، اور ظہر[2] زوال کے بعد ادا کرتے تھے، اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب مین جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہین رہا، اور عشا تہائی رات تک ادا کرنے مین آپ تامل نہین فرماتے تھے[3] حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہین کہ آنحضرت صلعم ظہر کی نماز دوپہر مین پڑھا کرتے تھے، اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا، اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا، اور عشا مین کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت، اور صبح اندھیرے مین پڑھتے تھے، صحابہ کہتے ہین کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازون کی دو پہلی رکعتون مین آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے، مغرب مین سورۂ المرسلت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشا مین اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرأت کی ہے، اور صبح مین سورۂ طور پڑھی ہے[4]،

[1] صحیح مسلم باب اوقات الصلوٰۃ الخمس [2] صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال [3] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا، [4] ایضاً باب القرأۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر، بروایات متعددہ،

اس قسم کی اور بیسیون روایتین ہین، اور روایتون پر کیا موقوف ہی، اس وقت سے آج تک

تمام امتیانِ محمد رسول اللہ صلعم کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابلِ تردید حجت ہی،[1]

تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیون؟ نمازِ پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی،

عام امت کے لئے نفل ہو گئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہی،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی	نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر،
غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ	(ظہر، عصر، مغرب) رات کی تاریکی تک
قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا، وَمِنَ	اور صبح کی قرأت قائم کر، بیشک صبح
الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً	کی قرأت مین حضور ہوتا ہے، اور رات
لَّكَ وَفی عَسٰٓی اَنْ يَّبْعَثَكَ	کے حصہ مین تو اٹھکر (اوقاتِ مقررہ سے)
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا،	زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھکو تیرا رب قابلِ
(اسراء - ۹)	تعریف مقام مین اٹھائے،

غور کرو کہ جب تک اوقات مقررہ نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز مین جتنا

زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچون وقت کی ایک ہی وقت مین نماز تھی، یعنی

نماز کی پانچ پتیون والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتون

کی نمازین الگ الگ ہوئین تو اُن کے بقدر رات کی طویل نماز مین تخفیف ہو گئی، اور حکم آیا کہ

[1] چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز مین غلط فہمی پھیلانی چاہی ہی، اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ اُن کی غلط فہمی دور ہو جائے،

فَاقْرَؤُا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو[1]، اس کے بعد اس آیتِ پاک مین جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز کی تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہان ایک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیتِ پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نمازِ تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی،

قبلہ | انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہین ہوسکتا جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہی، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہین ہوسکتا، جب انسان کوئی کام کریگا تو ظاہر ہے کہ اس کا منھ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز مین کسی خاص سمت کا تعیین نہ ہوتا، اور یہ عام اجازت دیدیجاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منھ کرکے نماز ادا کرے، تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہوجاتا، اور نمازیون کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی، بلکہ اگر ایک ہی مسجد مین ایک ہی وقت مین کوئی پورب کوئی پچھم، کوئی اُتر اور کوئی دکھن رُخ کرکے کھڑا ہوتا تو یہ وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بنجاتا، اس لئے ہر مذہب مین عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہی، صابئی (ستارہ پرست) قطبِ شمالی کی طرف منہ کرتے تھے، کہ ستارون مین وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہین کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے[2]، آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہین، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہین، اور بُت پرست کوئی

---

[1] صحیح مسلم جلد اول باب وجوب قراۃ الفاتحہ حدیث اجمع فصلٌ فانک لم تصل، نیز دیکھو فتح الباری جلد اول ص ۲۹۳، [2] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ،

نہ کوئی بُت آگے رکھ لیتے ہین، اکثر شامی قومین مشرق کی طرف رخ کرتی تھین، یہانتک کہ یہودیون کے ایک فرقہ اسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے[1] بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہان عبادت کرنا چاہتے تھے، اس کو چند پتھرون سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنا لیتے تھے[2]، قرآن مجید مین ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر مین تھے، تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھرون کو قبلہ رخ بنائین اور نماز ادا کرین،

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، (یونس-۹)	اور اپنے گھرون کو قبلہ رخ کرو، اور نماز کھڑی کرو،

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعۂ صحف مین متعدد موقعون پر آیا ہے، حضرت داؤدؑ کے زبور مین ہے،

"لیکن مین جو ہون سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر مین آؤنگا، اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کیطرف تجھے سجدہ کرونگا" (۵-۷)

سلاطین اول مین ہے،

"جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہان کہین تو انھین بھیجے، اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تونے پسند کیا، اور اس گھر کی طرف

---

[1] یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" مین ہین، [2] سفر تکوین باب ۱۲-۸ و ۱۳-۴ و ۲۸-۱۷-۱۸-۱۹ و ۳۱-۱۳)

جسے مین نے تیرے نام کے لئے بنایا" (۷-۴۴)

اسی صحیفہ مین آگے چل کر ہے:-

"اور اس زمین کی طرف جو تونے ان کے باپ دادون کو دی، اور اس شہر کی طرف جسے تونے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو مین نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگین" (۴۸)

اہل عرب مین کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل مین بیت المقدس کو تھی، اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے،

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا	اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ
فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ،	منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو نیکیون
(بقرہ - ۱۸)	کی طرف دوڑو،

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب مین تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو، اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے،

ابراہیمی قومون مین اس قسم کی مرکزی مسجدین دو تھین، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے، جنھون نے اس کو قبلہ بنایا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکۂ معظمہ میں رہے، خانۂ کعبہ کی طرف اس طرح منھ کر کے کھڑے ہوتے تھے، کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال، اور خانۂ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کیطرف رُخ کرتے تھے، کہ وہی انبیاے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا، لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملتِ ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے، جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسمٰعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ بے سمت ہے، اور سب سمتیں اسی کی ہیں،

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا	اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھم، تو
تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ	جدھر رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا منھ ہے،
وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ،	بیشک اللہ بڑی گنجایش اور وسعت
(بقرہ - ۱۴)	والا، اور بڑے علم والا ہے،

اس کی گنجایش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے، اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَیَقُوْلُ السُّفَہَآءُ مِنَ النَّاسِ	بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں)

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا	کو اُن کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا،
عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ	جس پر وہ تھے، کہدے کہ پورب اور پچھم
الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ	دونون خدا کے ہین، وہ جس کو چاہتا ہے
اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ (بقرہ-۱۷)	سیدھا راستہ دکھاتا ہے،

یہود جن کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا، کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانۂ کعبہ کو کیون قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا،

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	نیکی یہی نہین کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	کی طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا،
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	قیامت، فرشتون، کتاب اور پیغمبرون
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ	پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اسکی
وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی	محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر)
الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ	رشتہ دارون، یتیمون، غریبون، مسافرون
وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ	سائلون اور غلامون کو (آزاد کرانے مین)
وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	دے، اور نماز پڑھے، اور زکوٰۃ دے اور
وَاٰتَی الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	(نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ	ہین اور سختی اور تکلیف اور جنگ مین صبر
فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ	کرتے ہیں، یہی وہ ہین جو سچے ہوئے

الْبَأْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ-۲۲) اور یہی پرہیزگار ہین،

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام مین قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رُخ کیا جائے فی نفسہ عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہ تھی، لیکن چونکہ نمازون مین اُمت کے نظامِ وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رُخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے سنہ۲ھ مین خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	پس تو اپنا منھ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی
الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ	طرف پھیر، اور تم لوگ جہان بھی ہو اسی
فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ-۱۰)	کی طرف اپنے منھ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہین، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چارون طرف چارون سمتون سے نماز پڑھی جاسکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال سب بہ یک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہین، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانون کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعیّن سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطبِ شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی، اور ستارہ پرستی کا رواج ہوگیا تھا، اس کا کلیتہً خاتمہ ہوگیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس مین بہت سی مصلحتین تھین،

۱- یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک مین منھ پھیر سکے ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذر چکا، بعض اہلِ مذاہب اُن چیزون کو سامنے رکھتے تھے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بُت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی مین گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہین بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت مین "جگہ سے نہ ٹلنے والا" قطب تھا اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے،

۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منھ کرنا ستارہ پرستی ہوتی کسی اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہو کہ چار سمتون مین سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کیجاتی اس کے لئے ضرور تھا، کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستارون کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہین، کیونکہ ہر سمت مین کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کیجاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجوہِ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بنجانا لازمی تھا،

۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتون کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ

بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدون مین سے اُن کی نسل نے دو مرکزی مسجدون کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جسکو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانون مین بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسمٰعیل کا مذہبی مرکز تھی،

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا مین پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا،	انسانون کے لئے (خدا کا) بنا، وہ ہے
(اٰل عمران ۔ ۱۰)	جو مکہ مین ہے،
وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ	اور جبکہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ بیت اللہ کی
مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ، (بقرہ۔ ۱۵)	بنیادین اٹھا رہے تھے،

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہدِ اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہین
لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ	کہ خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ)
رَّبِّھِمْ، (بقرہ۔ ۱۷)	اُن کے پروردگار کی طرف سے (ہے)

پولوس (پال)، ایک خط مین جو گلیتون کے نام ہے لکھتا ہے،

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے، دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا، (اسمٰعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا، اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اور سینا مصر کے راستہ میں ہی) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور بھی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے، پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلیتون کے نام ۲۲-۲۶، باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں، "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے، اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں، اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی "غلام اولاد" نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی

بغاوت، تمرد، سرکشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا، جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتون مین ہی، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا،

معراج مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) مین نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بنجانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد مین بسلسلۂ معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہی وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	کے وقت مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے اس
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ	مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا
بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ (بنی اسرائیل ۱)	جس کی چارون طرف ہم نے برکت دی ہے

کی تفسیر مین لکھا گیا ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس مین قبلہ ہونے کی شان باقی نہین رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی، جسکا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا، (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ	اور جب خدا نے چند باتون مین ابراہیم
بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ط قَالَ اِنِّیْ	کو آزمایا تو اس نے ان باتون کو پورا کیا

جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۚ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۔

(بقرہ ۔ ۱۵)

خدانے کہا مین تجھ کو لوگون کا پیشوا بنانے والا ہون، (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل مین سے (خدانے) فرمایا میرا عہد ظالمون کو شامل نہ ہوگا، اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگون کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا، اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد کیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف کرنے والون، اعتکاف کرنے والون، رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون کیلئے

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزارون برس پہلے سے خدا کے علم مین تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا، جہان کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا مین اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

اور تو جہان بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ-۱۸) منہ کر،

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیم کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رُخ ہی کرلے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا،

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ-۱۴) پس جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے،

خانۂ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں، نہ مشرکوں بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دیجاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے، اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے، اور صرف فضا باقی رہجائے، تب بھی کعبہ قبلہ رہیگا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جاکر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمتِ قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو اُدھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جارہی ہو پڑھ سکتے ہو، لڑائی کی حالت میں سخت خوف کی صورت میں بھی نماز کے لئے قبلہ کی قید نہیں رہتی[1]، یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی تھیں قطعی تردید کرتی ہیں، اور یہی اس باب میں دینِ محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر بقرہ باب قولہ عزوجل فان خفتم فرجالاً او رکباناً،

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے سامنے موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان ہے[1]، اگر خیال کے پر پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں،

رکعتوں کی تعداد ایک قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشا کے وقت چار چار، اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہو سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکنڈ میں تمام ہو جاتی، اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا جاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں،

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلہ،

مکہ مین مسلمانون کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی،[۱] اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپکر وہ نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اُس وقت نماز مین زیادہ رکعتین ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ مین ہر نماز صرف دُو رکعتون کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشا مین چار چار رکعتین کر دی گئین، لیکن مسافر کے لئے وہی دُو رکعتین قائم رہین کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتین ہین، مسافر کے لئے دُو اور بحالت خوف ایک[۲]، اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتون کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے،

مغرب اور صبح کی نمازین قیام و سفر دونون حالتون مین یکسان ہین، مغرب کی تین رکعتون کا آدھا ممکن نہین، اور صبح مین خود دُو رکعتین ہین، ان مین کیا کمی ہو سکتی ہے ؟ لیکن مغرب اور صبح مین یہ تین اور دُو رکعتین کیون ہین ؟ اسکی گرہ کشائی اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے: "مغرب مین تین اس لئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح مین دُو اس لئے کہ اس مین دُو رکعتون کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دیگئی ہے[۳]"

حضرت عائشہؓ کے ارشاد مین تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستون)

---

[۱] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم صلوۃ المسافر و مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۱ و ابن خزیمہ و ابن حبان و البیہقی (فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۲) [۲] صحیح مسلم صلوۃ المسافر، [۳] مسند احمد بن حنبل ۶-۲۴۱،

کی عبادت کا وقت تھا[1]، مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کرین، اسی لئے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد وہ رکھی گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے[2]، یہ عددِ واحد تو ہو نہین سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہین ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہین، بنا برین توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونون باتین ثابت ہوتی ہین، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہین ہوتا، جو ایک رکعت ہونے مین فوت ہو جاتا، اس لئے مغرب مین رکعتون کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جس کو غروب کہتے ہین، اسی وقت ہوتا ہے، اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اُس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

اوتروا یا اھل القرآن فانّ	اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو،
اللّٰہ وترٌ یحب الوتر،	کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے، اور وہ
(ابوداؤد)	وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام اور سکون کے بعد بیدار

[1] صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث، [2] عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہین کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جورات کی وتر ہے،

ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزون ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر اور مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزون ہے، اور قرآن مجید مین اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظون مین کیا گیا ہے،

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا، (بنی اسرائیل-۹) صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے،

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد کے بجاے اس کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتین تو دو ہی رہین، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کردی جاے، اور سورتین بڑی بڑی پڑھی جائین، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازون کی ایک رکعت مین تقریبًا پندرہ آیتین تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز مین ساٹھ آیتون سے لیکر سو آیتون تک قرأت کرتے تھے،[۱] اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا،[۲]

رکعتون کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثنار عامل بھی ہین، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک مین نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جس مین یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائین، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جاے، اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتین ہو جاتی ہین، اور مقتدیون کی جماعت کے ساتھ ایک ایک، اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ [۲] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفہا فی تمام،

کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علٰحدہ علٰحدہ ادا کرتے ہین۔[1] جب نمازِ خوف مین قصر کی دو رکعتین ثابت ہوئین، تو اصل رکعتین چار ہونگی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازون مین ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نسار کے پندرہوین رکوع مین ہین،

نماز کے آداب باطنی قرآنِ پاک اور احادیثِ نبویہ مین نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہین، مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکرِ الٰہی، اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہین، نماز جسم و روح دونون کی عبادت ہے، اگر اس مین جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح مین اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامتِ صلوٰۃ، نماز پڑھنے کے لئے قرآنِ پاک مین جابجا اقامتِ صلوٰۃ "(نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہین، بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان وسنن کیساتھ ادا کرنے کے ہین، چنانچہ خوف کی حالت مین جہان نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو، اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہین کہ نماز کو اس کے تمام آداب وارکان و شرائط کے ساتھ بجالایا جائے اس بنا پر نماز

[1] احادیث مین نمازِ خوف کی بہت سی صورتین ہین، جن مین سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کے رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کر لیا ہے، مگر محدثین مین کچھ ایسے لوگ ہین جو یہ کہتے ہین کہ یہ سب صورتین جائز ہین، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتین لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہین جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی،

جنگ مین اشارون سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے،

مین اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع وخشوع ملحوظ رہنا چاہیے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت، نماز کے آداب باطنی مین دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ، (بقرہ۔۳۱) — اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہؓ کہتے ہین کہ ہم لوگ پہلے نماز مین باتین کر لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اُتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک مین جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت مین (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہین، چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت مین ذکر ہے، اس کے متعدد معنون مین سے ہر معنی نماز مین مقصود ہے، کیونکہ نماز مین ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتون اور باتون سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے دعا بھی ہے عبادت بھی ہے، اس مین دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان مین سے کوئی بھی کسی نماز مین کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف مین کمی ہو جائے گی،

خشوع، تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک مین نمازیون کی یہ صفت آئی ہے،

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون۔۱) — (وہ مومنین کامیاب ہین) جو اپنی نماز مین خشوع وخضوع کرتے ہین،

خشوع کے لغوی معنی یہ ہین، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھین نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے

مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی،

تبتّل، تبتّل کے اصلی معنی "کٹ جانے" کے ہین، اور اس کے اصطلاحی معنی ہین خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآن پاک مین جہان اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل مین ہی،

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر
اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ	کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی
مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ	رات یا اس سے کچھ کم و بیش اور اس
وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا	مین قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝	ایک بھاری بات اتارنے والے
اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ	ہین، بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ	مین طمانیتِ قلب کا زیادہ موقع ہے
فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝	اور قرآن سمجھکر پڑھنے کے لئے زیادہ
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ	ہی موزون ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝	فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام
(مزمل-۱)	لے اور ہر چیز سے کٹ کر اسی کا ہو جا،

یعنی نماز کی حالت مین خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئین، صحیح مسلم مین حضرت عمرو بن عبسہؓ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلعم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو، کر کے جب کوئی نماز کیلئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزاوار ہے، اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت[1] پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے،

تضرع، تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہین، (لسان العرب) نماز مین بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز و الحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے، ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا،

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف - ۷)

تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو،

اخلاص، نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر "اخلاص" ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہین ہے تو نماز نماز نہین، بلکہ ریا، اور نمائش ہوگی، اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئیگا، فرمایا،

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ

اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رُخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے

---

[1] صحیح مسلم اول، باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا،

لَهُ الدِّیْنَ ط (اعراف - ۳) ساتھ پکارو،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز مین اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے،

ذکر، نماز خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل مین کچھ اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہو گی، اسی لئے فرمایا،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ، (طٰہٰ - ۱) میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہین ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے، اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے،

فہم و تدبر، نماز مین جو کچھ پڑھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنون کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے، کہ اس حالت مین سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو مین نہین، فرمایا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ	نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ
سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا	مین ہو، یہانتک کہ (اتنا ہوش آجائے
تَقُوْلُوْنَ، (نساء - ۷)	کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو،

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز مین جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپنے نیند کے غلبہ کی حالت مین نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے، کہ اس مین بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو۔[۱] دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا نماز کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔[۲] حاکم کی مستدرک میں ہے، کہ آپ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے یہاں تک کہ نماز ختم کرلے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔[۳]

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	پس پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ	سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوے
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (ماعون ۱)	کی نماز پڑھتے ہیں،

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ، اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ، اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع و خضوع، تضرع و زاری

[۱] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد ا صفحہ ۲۹۳ [۲] بخاری و ابوداؤد و مسند احمد عن انس [۳] مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اول ص۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور چاہئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں، اُن کے معنی ذہن نشین کرلیں، اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے،

اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہین، ان سے نماز مین تغافل برتا جائے،

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات تعلیمات اور عملی مثالین ہین جنمین آپنے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، ایک دفعہ مسجد نبوی مین ایک شخص نے اکر نہایت عجلت مین نماز پڑھی، آپنے فرمایا "اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تونے نماز نہین پڑھی"[1] اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپنے پھر وہی ارشاد فرمایا، جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھون؟ فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو"

نماز مین سر اٹھا کر اوپر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضور قلب مین خلل پڑتا ہے، اس لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "نماز مین سر اوپر اٹھا کر نہ دیکھا کرو، کیا تمھین یہ ڈر نہین کہ تمھاری نظر پھر واپس نہ آسکے"[2] آپنے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز مین دوسری طرف ملتفت نہین ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے، تو خدا بھی اپنا منھ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے[3]، طبرانی مین ہے کہ آپنے ارشاد فرمایا "جب تم مین سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو، تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہان تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز مین منھ پھیر کر ادھر اودھر نہ دیکھو، کیونکہ جب تک تم نماز مین ہو خدا سے باتین کر رہے ہو"[4] مسند بزاز مین ہے کہ جب بندہ نماز مین ادھر اودھر دیکھتا ہے

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الصلوۃ، [2] مسند احمد عن جابر بن سمرہ، [3] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ وابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ، [4] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرہ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۱،

توخدا فرماتا ہی تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ۔ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیتا ہے[1]۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے"، صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا، اور خشوع نہ ہونا"[2] ایکدفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ اے فلان تو خدا سے نہین ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتین کرتا ہے، پس سوچنا چاہیے کہ اس سے کس طرح باتین کرے[3]۔ "صحیح مسلم مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہین پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہین سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے[4]۔" نماز کی حالت مین تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "نماز کی حالت مین خدا تمھارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو[5]۔" دوسری روایتون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتین کرتا ہوتا ہے[6]۔" مسلم کی ایک اور روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز مین خدا تمھارے منھ کے سامنے ہوتا ہے[7]۔"

---

[1] کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۲ [2] مسند احمد عن قتادہ، ودارمی باب من لا یتم الرکوع والسجود، وابن ابی شیبہ وابن خزیمہ وابن حبان، وعبد ابن حمید وعبدالرزاق، وطبرانی فی الاوسط، اخیر لفظ بعض روایتون مین نہین ہے، [3] مستدرک حاکم فی الصلوۃ جلد اول صفحہ ۲۳۶ (علی شرط مسلم) [4] صحیح مسلم کتاب الصلوۃ باب الامر بتحسین الصلوۃ [5] صحیح مسلم کتاب المساجد باب النہی عن البصاق فیہا، وحاکم فی المستدرک وابوداؤد، [6] صحیح بخاری ومسلم کتاب الصلوۃ والمساجد [7] ایضاً باب النہی عن البصاق فی

نماز مین سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتین فرمائی ہین، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو[1] اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اُس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیون کے سکون مین خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہون تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کر لیجائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو، اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو، تو پہلے کھانا کھا لینا چاہیے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو[2] اسی طرح اگر استنجا یا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لیجیے تب نماز پڑھی جائے[3]

آغاز اسلام مین لوگ نماز کی حالت مین ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے، لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہوگئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز مین سلام کیا، اور جب آپ نے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انھون نے اس کا ذکر کیا فرمایا[4]

اِنَّ فِی الصَّلٰوۃِ لَشُغُلاً، نماز مین اور ہی مصروفیت ہوتی ہے،

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار مین دل محو ہو جائے، اور توجہ ہٹ جائے مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے گل بوٹون کی ایک

---

[1] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار، [2] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی باب کراہیۃ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام، [3] صحیح مسلم و ابوداؤد و موطاے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ، [4] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ ،

چادر اوڑھ کر نماز پڑھی، پھر فرمایا "اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ"[1] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپؐ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی، آپؐ نے اسکو اتروا دیا،[2]

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے، کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتہً سکون میسر ہوتا ہو، اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیئے تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی جہنم کی آگ ہے، اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو،

فانّ الصّلوٰة مشهودة محضورة[4] کیونکہ نماز میں حضور[3] ہوتا ہے،

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اُسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے"[5] کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی، اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے

[5] صحیح بخاری کتاب الایمان،

[1] صحیح مسلم باب کراہیۃ الصلوٰۃ فی ثوب لہا اعلام، [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس، [3] محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے،
[4] صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث،

ہچکیان بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہو[1]،

رات کی نمازون مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت وکبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتین آتین، تو دعا کرتے[2]، آپ نے فرمایا کہ "نماز دو دو رکعت کرکے ہے، اور ہر دوسری رکعت مین تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا، تو اس کی نماز ناقص رہی[3]"

ایک دفعہ آپ اعتکاف مین تھے اور لوگ مسجد مین زور زور سے قرأت کررہے تھے، آپ نے فرمایا "لوگو! تم مین سے ہر ایک خدا سے مناجات کررہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات مین اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[4]"

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمایئے ارشاد ہوا کہ "جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمھاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو، اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو[5]" کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کرسکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتین کیا کیا ہیں؟

---

[1] ترمذی وابوداؤد باب البکار فی الصلوٰۃ [2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۲، [3] ابوداؤد باب صلوٰۃ النھار، وترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ ص۵۱ مطبوعہ دہلی، [4] ابوداؤد صلوٰۃ اللیل، [5] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب،

اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے، اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کیساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے،

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں،
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	وہ قرآن کو مانتے ہیں، اور وہ اپنی نماز
يُحَافِظُوْنَ، (انعام-۱۱)	کی نگہداشت کرتے ہیں،

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت،

نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو اُن کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بنجاتا ہے،

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا

شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصون کو چھپانا نہایت ضروری ہی، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہرون کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہانتک کہ غیر قریشی عورتین جب حج کے لئے آتی تھین تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھین اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھین، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہانتک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اسکے نزدیک نماز ہی درست نہین، آیت نازل ہوئی،

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

مردون کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتون کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤن تک چھپانا نماز مین نہایت ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربون کو اور جہان جہان اسلام گیا، وہان کے برہنہ باشندون کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن مین پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان مین مسلمانون اور غیر مسلمانون کے لباسون پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جا سکتا ہی کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق مین دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومین زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بیحیائی پر اتر آتی ہین، مرد گھٹنون سے اونچا لباس اور عورتین نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہین، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قومون کو اعتدال سے تجاوز نہین کرنے دیتی، چنانچہ عورتون کو تیز خوشبو لگا کر مسجد مین جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑون کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہدیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہین ہوتی،

طہارت

۲- اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا،

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (مدثر-۱) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہوں، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہے" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا" غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلا، اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ، (توبہ - ۱۳)

اس مسجد مین کچھ لوگ ایسے ہین جو پسند کرتے ہین کہ وہ پاک وصاف رہین اور اللہ تعالیٰ پاک وصاف رہنے والون کو پیار کرتا ہے ،

جب اسلام نے طہارت وپاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کرسکتا ہو ،

صفائی

۳- نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہو دن مین عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منھ ، ہاتھ ، پاؤن جو اکثر کھلے رہتے ہین اُن کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے ، ناک مین پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہو ، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریان ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہین اور ناک کے نتھنون کو پانی ڈالکر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہین ،

دنیا مین اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہین ہے جس نے ناک مین پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو ، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے ، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہین ، نمازیون کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک مین جہان پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے ،

اہلِ عرب اور خصوصاً بدو دانتون کو بہت کم صاف کرتے ہین جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریان پیدا ہوتی ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو مین اس کو ضروری قرار دیتا۔"

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہلِ عرب نہاتے کم تھے، اُن کے کپڑے عموماً اُون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ مین شرابور ہوجاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتون پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد مین نماز پڑھنے آتے، تو اُن کے بدن اور کپڑون سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ مین کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنے کی بڑی تاکید کی ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا،

غسل یوم الجمعۃ واجب علی کل محتلم۔ (بخاری کتاب الجمعہ)	جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے،

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا، اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات مین غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہین، فرمایا،

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا، (مائدہ-۲)	اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ،

پابندی وقت

۴۔ انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ

اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابندِ اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی اُن کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اُس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اُس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے، اُن کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں، اور نماز کے اوقات اُن کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا اُن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمانؓ فارسی کا مقولہ ہے،

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفیٰ اوفی به ومن طفف فقد علمتم ما للمطففین، [1]

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائیگا، اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے،

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے،

صبح خیزی

۵۔ طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب

[1] کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ، جلد چہارم ص ۲۳۰ بحوالہ مصنف عبد الرزاق،

سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہین، جو لوگ نماز کے پابند ہین وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہین کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائیگا، صبح کو وقت پر آنکھ نہین کھل سکتی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نمازِ عشا کے بعد بے کار باتین کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا[1] ہے، تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیزی مسلمانون کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پرتاثیر آواز :-

الصلوٰۃ خیر من النوم، — سونے سے نماز بہت بہتر ہے،

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے،

خدا کا خوف ۶- ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اسکو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگون سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہین گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤن بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہین، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیون سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت-۵) — بے شک نماز بے حیائی اور بری باتون سے روکتی ہے،

ہشیاری ۷- نماز عقل و ہوش بیداری اور آیاتِ الٰہی مین تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء،

معرفت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزین جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دین نماز کی حقیقت کی منافی ہین، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہین ہوئی تھی، اسکو پی کر نشہ کی حالت مین نماز پڑھنا جائز نہ تھا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى	نشہ کی حالت مین تم نماز کے قریب نہ جاؤ،
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (نساء-۷)	یہانتک کہ تم سمجھنے لگو، جو کچھ تم کہتے ہو،

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزون سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دین قطعاً پرہیز کرے گا،

مسلمان کا امتیازی نشان،

۸- مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونون گروہون مین کوئی امتیاز نہین کر سکتا تھا، احکام مین حج ایک ایسی چیز ہے، جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز بھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزء تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس مین حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہین ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اسکے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت بھی گران نہین ہو سکتی تھی، فقرا کیساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اسکا معیار نہین قرار دیا جا سکتا، کیونکہ روزہ مین چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بآسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونون گروہون مین حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ مین سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا،

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى لا (نساء-۲۱)	اور جب وہ نماز پڑھنے کو اُٹھتے ہین تو کسلمندی کے ساتھ اٹھتے ہین،

نیز فرمایا،

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بقرہ-۵)	اور خضوع وخشوع والون کے علاوہ نماز سب پر گران ہے،

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہین، آنحضرت صلعم نے فرمایا

لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء[1]	منافقین پر فجر وعشا، سے زیادہ کوئی نماز گران نہین ہے،

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ جب ہم (صحابہ) کسی کو عشا، اور صبح کی نمازون مین غیر حاضر پاتے تھے، تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے"[2]

مدینہ آکر نماز مین قبلہ کی تبدیلی جہان اور مصلحتون سے تھی، وہان ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہین سمجھتے تھے، مدینہ مین یہود آباد تھے جن مین کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہین کرتے تھے، اس لیئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

[1] بخاری کتاب الصلوۃ باب فضل صلاۃ العشاء فی الجماعۃ، [2] مستدرک حاکم (دلی شرط الشیخین) جلد اول ص ۲۱۱،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ	اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں
عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ	بنایا، لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول
مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ	کی پیروی کرتے ہیں، اُن سے الگ کر دیں
اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ	جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے، اور یہ قبلہ
هَدَى اللّٰهُ ؕ (بقرہ-۱۷)	گران ہوا، لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہیگی، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا، اور ہمارے قبلہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے[۱]،

جنگ کی تعلیم

۹- باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازوں میں نظر آتا ہے، ابوداؤد میں ہے،

كان النبي صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلعم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی
وجيوشه اذا علوا الثنايا	پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا
كبروا و اذا هبطوا سبحوا فوضعت	تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقہ پر قائم
الصلوٰة على ذالك، (ابوداؤد)	کی گئی،

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری، اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو

---

[۱] بخاری باب فضل استقبال القبلہ،

صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے، اوران کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑون مین پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت، دھوپ کی شدت مین گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیون سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا وزاری کرلینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری مین مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہین کہ ہم فرضی راحت وتکلیف سے بے پروا ہو کر، عمل کی طاقت اپنے مین پیدا کرین، اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھین اور اس کے لئے عارضی تکلیفون کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائین، ہفتہ مین ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانون کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُرآرام سے پُرآرام وقت مین ممکن تھا، مگر اس کیلئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا، تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ مین بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہین، اور نمازِ جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات مین اس کے لئے کس قدر ممد ثابت ہوتی ہے،

دائمی تنبہ اور بیداری

۱۰- تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے، لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار، اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات مین صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اوّلاً تو ہر شخص پر فرض نہین ہین، اس کے ساتھ روزہ سال مین ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر مین ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہین ہو سکتے، برخلاف ان کے نماز دن مین پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت

وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام وقعود، جہر خفار، تسبیح وتہلیل تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان واعمال مین تنوع وامتیاز پیدا کر دیا ہے، جن مین ہر چیز نفس مین تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور ہر چوبیس گھنٹہ مین چند گھنٹون کے وقفہ سے نفسِ انسانی کو ہشیار اور قلبِ خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبّہ ہوا کرتا ہے،

الفت و محبت

۱۱- نماز مسلمانون مین باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن مین پانچ دفعہ جمع ہون، اور باہم ایک دوسرے سے ملین تو اُن کی بیگانگی دور ہوگی، ان مین آپس مین محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہین گے، قرآنِ پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے،

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا	اور خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو
تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ لا مِنَ	اور مشرکون مین سے نہ ہو ان مین
الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا	سے جنہون نے اپنے دین مین پھوٹ
شِيَعًا (روم-۴)	ڈالی، اور بہت سے جتھے ہوگئے،

اس سے معلوم ہوا، کہ نماز کا اجتماع مسلمانون کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیون کا موقع کم ملیگا،

غمخواری

۱۲- بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانون مین باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر وغریب سب ایک جگہ جمع ہون گے، اور امراء اپنی آنکھ سے غریبون کو دیکھینگے،

تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی،

ابتداے اسلام مین اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد مین رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہؓ اور خود آنحضرت صلعم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگون کو ساتھ لاتے اور اپنے گھرون مین کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہین، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مین نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے،

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا	اور نماز قائم کرتے ہین، اور جو کچھ ہم نے
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ، (بقرہ-۱)	دیا ہے اس مین سے صرف کرتے ہین،

اجتماعیت

۱۳- اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قومون نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہین، جن قومون کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان مین بھی اس اجتماعیت کی نمایش کلبون، کانفرنسون، انیورسریون، اور دوسرے جلسون، جلوسون، اور مظاہرون سے کیجاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہان فائدے پہنچاتی ہے، وہان اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہوا تو وہی رنگ رلیون رقص وسرود، شرابخواری، قماربازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک وحسد، بلکہ قتل وغارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالین عرب مشرکون مین بھی ملتی تھین

اور اب بھی ملتی ہین، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہون اور فسادون کا مرکز بنجاتے ہین، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلبِ انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے، اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجاے نیکی کے رُخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازین، ہفتہ مین جمعہ کی نماز اور سال مین دو دفعہ عیدین کی نمازین مقرر کین، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو، اور مشرکانہ بدیون اور اخلاقی برائیون سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوتِ خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع مین دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اسکی بارگاہ مین توبہ وانابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگیِ خیال اور اخلاصِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے،

کامون کا تنوع

۱۴- انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام مین مصروف رہین تو سکون و اطمینان عیش و راحت، اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس مین انسان کو حرکت و سکون دونون کا یکسان موقع ملتا رہتا ہو، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی مین شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم مین نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانون مین اپنے ہر کام کی لذت قائم

رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال مین ایک دفعہ یا عمر بھر مین صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پر پہنچکر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازین خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جاکر منتہی ہوئی اب نیند آگئی، اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤن کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولتمند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہین حاصل کرتے، وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہین، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان چند گھنٹون تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ مین ہاتھ منھ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہوگیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کیلئے نئی قوت پیدا کرلی،

تربیت ۱۵- انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اُٹھنے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری، اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام مین اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن مین کئی دفعہ ہو، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارسے عہدہ برآ ہونے کیلئے انسان مین استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان مین اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہین ہوسکتی، اس لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح مین کہا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ (معارج-۱)	وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

احب العمل الی اللہ ادومہ وان قل (ابوداؤد باب ما یومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ)	محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو،

نظمِ جماعت

۱۶- کسی قوم کی زندگی، اس کی نظمِ جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے اُن کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکساں حرکت و جنبش کرنا اُن کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظامِ جماعت کی درستی پر موقوف ہے اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔[۱]

[۱] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدہا وابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف،

مساوات

۱۷- یہی جماعت کی نماز مسلمانون مین برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہان امیر و غریب، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہین ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف مین کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگون ہوتے ہین جماعت کی امامت کے لئے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت عہدہ اور منصب کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہان شاہ و گدا، اور شریف و رذیل کی تفریق نہین، سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے، ایک صف مین دوش بدوش کھڑے ہوتے ہین، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہین ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن مین پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانون کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہین اور بھی قائم ہے؟

مرکزی اطاعت

۱۸- جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانون کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح اُن کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہین، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کیلئے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو،

اطاعتِ امام کے لئے ایک طرف تو قوم مین فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے جس کی تعلیم مقتدیون کو نماز مین ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگون کے پیشِ نظر رہے، نماز ان دونون چیزون

کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء وجوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کیلئے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزون ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت میں مصروف ہو، نمازِ صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریکِ جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہؓ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا، اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی اس زمانہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے،

معیارِ فضیلت

۱۹- نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحبِ علم (اقرء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے[1]، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، آپ نے ان سے فرمایا کہ تم میں سے جسکو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام بنے، اتفاق یہ کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن تھے، انہی کو قرآن زیادہ یاد تھا، چنانچہ لوگوں نے انہی کمسن صحابیؓ کو اپنا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی وعملی فضائل کے

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ

حاصل کرنے کی تشویق وترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی مجلس عمومی

۲۰- آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانہ مین یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی وقومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانون مین منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانون کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل وسستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار، اور اسکے مذہبی واجتماعی وتمدنی وسیاسی واخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانون کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم وجماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانون کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار وتعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا،

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم وارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام وعیش اور فائدہ کو قربان کردینا، اور اختلاف باہمی کو تہ کرکے صرف ایک مرکز پر

جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت مین فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرلشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز اِنہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانون کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبری، اور وحدتِ قوت کا سبق دن مین پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہین، اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعیِ اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا،

العہدُ الّذی بیننا و بینھم	ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ
الصّلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر،	ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اسکو چھوڑا
(احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	اُس نے کفر کا کام کیا،

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہجاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اوّلین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے،

عرب کی روحانی کایا پلٹ وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بے گانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھون نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہین دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلّی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم سے دفعۃً کیا ہو گیا؟ اب عبادتِ الٰہی اوس کے ہر کام کا مقصد تھی، اب اس کو

اپنے ہر کام مین اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اسکی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہین چاہتی تھی، اُس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہین آتی تھی، اسکی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اس کی آنکھین اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھین، اسکی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی،

دل راکہ مردہ بود حیاتے زنو رسید ۔ تا بوئے از نسیم مئیش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی، کہ

وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (نساء-۲۱) ۔ اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہین،

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایان کی، کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتین بھی اُن کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کرسکین،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، (نور-۵) ۔ ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہین کرتا،

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال مین ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بیقراری تھی،

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ، (آل عمران-۲۰۰) ۔ جو خدا کو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہین،

راتون کو جب غافل دنیا نیند کے خمار مین ہوتی، وہ بسترون سے اٹھ کر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز مین مصروف ہوتے تھے،

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا، (سجدہ - ۲)

جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہوں سے علحدہ رہتے ہین، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہین،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ ارْکَعُوْا لَا یَرْکَعُوْنَ (مرسلات - ۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہین جھکتے،

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ

تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (فتح - ۴)

تم ان کو دیکھوگے کہ رکوع مین جھکے ہوئے اور سجدہ مین پڑے ہوئے، خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہین،

وہ جن کے دلون کی یہ کیفیت تھی، کہ

وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ ج (زمر - ۵)

اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہین رکھتے، مکدر ہو جاتے ہین،

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینون مین خشیتِ الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ، (انفال ۱ - وج - ۵)

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہین،

یہ خود قرآنِ پاک کی شہادتیں ہین جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسولُ اللہ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات مین کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہون، یا تجارت، یا محنت مزدوری، مگر ان مین سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہین کرتی تھی، قتادہ کہتے ہین کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل و عمل اُن کو یادِ الٰہی سے غافل نہین کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے[۱]، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ وہ بازار مین تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانین بند کر دین اور مسجد مین داخل ہو گئے[۲]،

صحابہؓ تمام تر راتین خدا کی یاد مین جاگ کر بسر کرتے تھے، یہانتک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتون مین بھی وہ عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی،

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی
اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ	رات کے قریب، اور آدھی رات اور
وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ	ایک تہائی رات تک کھڑا رہتا ہے اور
مَعَكَ ط	تیرے ساتھ کی ایک جماعت بھی اٹھ کر
(مزمل-۲)	نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ مین صحابہ کو راتون کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہان ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے

[۱] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البر مرسلاً، [۲] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۲۵۳ بحوالۂ عبدالرزاق،

مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اس والہانہ اندازِ عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآنِ پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ	اور اس غالب، رحم والے پر بھروسہ کر
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ	جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے
وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ،	اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے
(شعراء - ۱۱)	درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے،

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

یا ایّھا النّاس اطعموا الطعام	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ، اور
وافشوا السلام وصلّوا والنّاس	سلام کو پھیلاؤ، اور نماز پڑھو جب لوگ
نیام، (ترمذی)	سوتے ہوں،

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1] حضرت ابن عباسؓ

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ،

کہتے ہین کہ صحابہ راتون کو اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اور بہت کم سوتے تھے[۱]، حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے، ایک مین خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے مین اُن کی بیوی اور تیسرے مین ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا[۲]، حضرت عبداللہ بنؓ عمرو ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا، تو ان کو جاکر نصیحت فرمائی[۳]، حضرت ابودرداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز مین گذار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی اُن کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ اُن کے ہان جاکر مہمان ہوئے، جب رات کو حضرت ابودرداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، کہ اب نماز کا وقت ہے[۴]، کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہانتک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت مین بھی وہ اس فرض سے غافل نہین رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرخطر کام کے لئے کہین بھیجا تھا جب وہ منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہوچکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہین ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا، تو وقت نکل جائے گا، اور اگر عصر مین تاخیر کیجائے تو حکم الٰہی کی تعمیل مین دیر ہوجائے گی، اس مشکل کا حل انھون نے اس طرح کیا، کہ وہ اشارون مین نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے[۵]، سخت سے سخت مجبوری کی حالت مین بھی نماز اُن سے ترک نہین ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت مین

۱ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی صلعم من اللیل، ۲ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الخشف، ۳ صحیح بخاری کتاب الصوم، ۴ صحیح بخاری کتاب الصوم، ۵ ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب،

وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے،[1] پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی، کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا،[2] حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے، کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی،[3] حضرت تمیمؓ داری ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے، اور مزے لیتے تھے،[4] ع

شب شود صبح و ہمان محوِ تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے، کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں،[5] حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے، اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر سجدہ کرتے تھے، کہ حرمِ محترم کے کبوتر ایک سطحِ جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے،[6]

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں، اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن انکو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں

[1] نسائی کتاب الامامہ باب المحافظۃ علی الصلوٰۃ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ [3] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ و کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد یکون فی الطریق، [4] اسد الغابہ تذکرہ حضرت تمیمؓ داری، [5] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین، [6] حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ،

ساتھی کہتے ہین کہ تم نے اس وقت مجھے کیون نہ جگایا، جواب ملتا ہے، مین نے ایک پیاری سورۃ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دون، [1]

اس سے بھی زیادہ پُراثر منظر یہ ہے کہ دشمنون کی فوجین مقابل کھڑی ہین، تیرون کا مینھ برس رہا ہے، نیزون اور تلوارون کی بجلیان ہر طرف کوند رہی ہین، سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہین، کہ دفعتہً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفین نماز کی صفین بنجاتی ہین اور ایک "اللہ اکبر" کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنین جھکنے اور اٹھنے لگتی ہین،

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز، فاروق اعظمؓ امام نماز ہے، پیچھے صحابہ کی صفین قائم ہین، دفعتہً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے، اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپ غش کھا کر گر پڑتے ہین، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفین اپنی جگہ پر قائم ہین، حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہین، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے، تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے، [2]

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز مین زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگون نے ان کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے "ہان جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام مین اس کا کوئی حصہ نہین"۔ چنانچہ اسی حالت مین کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی، [3]

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد مین داخل ہوتے ہین، یا صبح کی نماز مین ہوتے ہین، [4] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہین، امام

[1] ابو داؤد کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم، [2] صحیح بخاری واقعۂ شہادتِ عمرؓ، [3] موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم، [4] الریاض النضرۃ للمحب الطبری جلد ۲ ص ۲۴۶، مصر،

مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان مین رونق افروز ہوتے ہین، عزیزون اور دوستون کی لاشین میدانِ جنگ مین نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہین، ہزارون اشقیا، آپ کو نرغہ مین لئے ہوتے ہین، اتنے مین ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنون سے اجازت چاہتے ہین، کہ "وہ اتنا موقع دین کہ آپ ظہر کی نماز ادا کرسکین[۱]"

نماز مین جس خضوع وخشوع کا حکم ہے، صحابۂ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر اُن کے اس روحانی ذوق وشوق مین خلل انداز ہوئی، تو انھون نے اسکو اس ذوق پر نثار کردیا، حضرت ابوطلحہؓ انصاری اپنے باغ مین نماز پڑھ رہے تھے ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر اودھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل مین کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آئے اور واقعہ بیان کیا، اور کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہِ خدا مین نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ مین نماز مین مشغول تھے، باغ اُس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلون سے لدا ہوا تھا، پھلون کی طرف نظر اٹھ گئی، تو نماز یاد نہ رہی جب اسکا خیال آیا تو دل مین نادم ہوے کہ دنیا کے مال ودولت نے اپنی طرف متوجہ کرلیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، انکی خدمت مین حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ مین مبتلا کردیا راہ خدا مین دیتا ہون، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار مین فروخت ہوا[۲]،

---

[۱] تاریخ طبری کبیر ص ۲۴۷ جلد ۷، واقعات ۶۱ھ، [۲] یہ دونون واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب مایشغلک عنہا مین مذکور ہین،

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم | نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس مین انسانون کے درمیان ہمدردی، اور باہم ایک دوسرے کی امداد، اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا اہم فائدہ نظامِ جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے، لیکن فقہی اصطلاح مین "زکوٰۃ" صرف اُس مالی امداد کو کہتے ہین، جو ہر اُس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو،

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب مین | زکوٰۃ بھی اُن عبادات مین سے ہے، جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفون مین فرض بتائی گئی ہے، لیکن اُن کے پیروون نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا، کہ بظاہر انکے مذہبی احکام کی فہرست مین اس کا نام بھی نظر نہین آتا، حالانکہ قرآنِ پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفون سے ہوتی ہے، کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزء لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی

تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزرہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اُسمین نماز اور زکوٰۃ دونون تھین

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ،	(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا)
(بقرہ ۔ ۱۰)	کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ
لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ	(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھے نماز
الزَّکٰوۃَ، (مائدہ ۔ ۳)	اور دیتے رہتے زکوٰۃ،

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر مین ہے،

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ	اور قرآن مین اسمٰعیل کا ذکر کر، بے شک
کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ	وہ وعدہ کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا
رَسُوْلًا نَّبِیًّا وَکَانَ یَاْمُرُ	پیغمبر تھا، اور وہ اپنے لوگون کو نماز او
اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَ	زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب
کَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا، (مریم ۔ ۴)	کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین،

وَاَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ	اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے
مَا دُمْتُ حَیًّا، (مریم ۔ ۲)	اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی،

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانورون مین ایک عشر یعنی دسوان حصہ (احبار ۲۷ ۔ ۳۰ ۔ ۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا، (خروج ۳۰ ۔ ۱۳ ۔ ۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا

اناج، کھلیان کی منتشر بالین اورپھل والے درختون مین کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی، اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کیجاتی تھی، اس کا ساٹھوان حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے۔ دسوان حصہ حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاوین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال مین دسوان حصہ بیت المقدس کے حاجیون کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافرون، غریبون، بیواؤن اور یتیمون کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا[۲]، اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف وآلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی[۲]۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعتِ موسوی کے ان ظاہری قواعد مین کوئی ترمیم نہین کی، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸-۱۰) مین ہے کہ "جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمایش، اور فخر کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے"۔ اسی انجیل کے ۲۱ وین باب کی پہلی آیت مین ہے:۔

"اگر کوئی دولتمند ہیکل کے خزانہ مین اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ مین کوئی غریب بیوہ خلوصِ دل سے دو دمڑی ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہین بڑھ کر ہے"۔

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع یازدہم مضمون "خیرات" (CHARITY) باب یہودیون مین "خیرات"۔
[۲] توراۃ خروج ۳۰-۱۶ و ۳۸-۲۶،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگون کو ترغیب دی، کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ

مین لٹا دے،

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے، مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت

مین داخل ہونا مشکل ہے، (متی ۱۹-۲۴)

ساتھ ہی انھون نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود

آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۱۷-۲۴)

توراۃ کے زمانہ مین چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانورون کے گلون

تک محدود تھی، اس لئے ان ہی دونون چیزون کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور

اُن کے سکون کی چونکہ قلت تھی اس لئے اُن کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہود

نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہین کی، علاوہ برین زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے

یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہین ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے

یعنی وہ کہان خرچ کیجائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہون، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصاً عرب

مین جہان کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان

بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ	(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ	نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا،

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، پھر تم پھر گئے، مگر تم مین سے تھوڑے

(بقرہ - ۱۰) اور تم دھیان نہین دیتے،

عیسوی مذہب مین گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزون نہین ہو سکتا تھا، اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبون مین بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہین کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی، جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا،

اسلام کی اس راہ مین تکمیل

محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت نے اس بارے مین بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ، زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی، اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا چاندی اور جانور اور پیداوار، اور ان مین سے ہر ایک کی علٰحدہ علٰحدہ شرحین مقرر کین، سونے چاندی مین چالیسوان حصہ اور پیداوار مین دسوان حصہ معین کیا، جانورون کی مختلف قسمون مین ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحین قرار دین، پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا،

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے اُن مین سے ہر ایک پہلو پر شریعتِ محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایان کرنا ہے،

اسلام مین زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی مین نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز، حقوق الٰہی مین سے ہے، اور زکوٰۃ حقوقِ عباد مین، ان دونون فریضون کا باہم لازم وملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے، کہ اسلام مین حقوق اللہ کے ساتھ حقوقِ عباد کا بھی یکسان لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنِ پاک مین جہان کہین نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین بتیس مقامات پر اقام الصّلوٰۃ" کے بعد ہی اِیتاءِ الزکوٰۃ، آیا ہے، مثلاً اَقِیمُوا الصَّلوٰۃَ وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ یا اَقَامُوا الصَّلوٰۃَ وَاٰتَوُا الزَّکوٰۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اُس کے دینے اور نہ دینے والون کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے بارگاہِ نبوی مین آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے ہین، تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان مین اس قسم کی متعدد حدیثین ہین جنمین یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائطِ بیعت مین داخل کیگئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہین کہ مین نے رسول اللہ صلعم سے بیعت تین باتون پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" وفد عبدالقیس نے ۵ھ مین نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو آپ نے اعمال مین پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی[1]،

۹ھ مین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا جب وہ

---

[1] یہ دونون حدیثین صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص۱۸۸ مین ہین،

یہ جان لین تو ان کو بتانا کہ دن مین پانچ وقت کی نمازان پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لین تو انھین بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولتمندون سے لیکر اُن کے غریبون کو دی جائے گی[1]،

صحابہ مین جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہین، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ مین فرق کرے گا مین اس سے لڑون گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ صلعم کے زمانہ مین بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا[2]، حقیقت مین یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا[3]، اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادون پر قائم ہے، جن مین سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظامِ روحانی

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیۃ، [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول صفحہ ۱۸۸، [3] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ . . . . فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، (توبہ-۱) ان مشرکون کو مار و جہان پاؤ . . . . تو اگر وہ توبہ کرین اور نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ دین تو انکو آزادی دے دو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ باب کراہیۃ الاختلاف،

نماز باجماعت سے جو کسی مسجد مین ادا ہو، قائم ہوتا ہے، اور نظامِ مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال مین جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونون چیزین، اسلام مین ساتھ ساتھ نظر آتی ہین اور ان کی انفرادی حیثیت کیساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعتِ محمدی نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہین، یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت مین جب بعض قبیلون نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال مین داخل نہ کرین گے، بلکہ بطورِ خود اس کو صرف کر دینگے، تو شریعتِ محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہین کیا، اور بزور ان کو بیت المال مین زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی بات تسلیم کر لیجاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ، اور مسلمانون کی امامت وجماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ مین غریبون کی چارہ گری، مسکینون کی دست گیری، بے سامانون کی امداد، یتیمون کی خبرگیری، بیواؤن کی نصرت، غلامون اور قیدیون کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ مین نظر آتی ہے،

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل،

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام

ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض مورخون اور محدثون کو اس بنا پر کہ ۹ھ مین زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات مین جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام مین زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مرادف تھا، اس کی مقدار، نصاب، سال، اور دوسری خصوصیتین جو زکوٰۃ کی حقیقت مین داخل ہین، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظون سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیون کا حق پہلے لفظ کا مظہر اعظم "نماز" اور دوسرے کا "زکوٰۃ" ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی، تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظون کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا مین چھپ کر خدا کی یاد (نماز) مین مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانون کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپ کی نسبت فرمایا، "آپ قرابتدارون کا حق پورا کرتے ہین، قرضدارون کا قرض ادا کرتے ہین، غریب کو کماتے ہین، مہمان کو کھلاتے ہین، لوگون کو مصیبتون مین مدد دیتے ہین[1]" غور کرو کیا زکوٰۃ ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہین ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہین، اور ان ہی دو اجمالی حقیقتون کی تشریح کا نام اسلام ہے،

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین مین وہ تمام بیج موجود ہین، جنسے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس مین نماز کی تمام تفصیلات

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اول،

کو صرف ایک لفظ مین ادا کیا گیا ہے،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر-۱)	اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ مین موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱)	اور بدلا بہت چاہنے کیلئے کسی پر احسان نہ کر،

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوے ہین، مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری، اس مین بہ تصریح دونون حکم موجود ہین، اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کیگئی ہے،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	اور نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ
وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَ	کو اچھا قرض دو، اور جو تم آگے
مَا تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ	بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ	پاس بہتر اور ثواب مین زیادہ
اَعْظَمَ اَجْرًا، (مزمل-۲)	پاؤ گے،

بعثت کے پانچوین سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہین، اور نجاشی نے اپنے دربار مین بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اسکی تعلیمات دریافت کی ہین، اور حضرت جعفرؓ نے اسکے جواب مین جو تقریر کی ہے، اس مین ہے "اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھین، روزے رکھین اور زکوٰۃ دین"[1] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی مین ہو چکا تھا، اور وفد عبد القیس نے (جو تقریباً ۵ھ مین آیا تھا) سوال کے جواب مین آپ نے جن احکام کی تعلیم

---

[1] مسند احمد جلد اول صفحہ ۲۰۲،

دی، ان مین ایک زکوٰۃ بھی تھی،[۱] ۶ھ مین جب نجاشی نے نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے، اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو انھون نے دوسری چیزون کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا بھی[۲] تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۵ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی،

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم صرف نظریون کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضاء اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مکہ معظمہ مین مسلمانون کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت ومسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بناپر اتنا ہی اُن کے لئے بہت تھا، کہ وہ کسی یتیم ومسکین اور بھوکے کو کھانا کھلادین، چنانچہ اس زمانہ مین اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی،

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ	اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی
فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ	(قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن
يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا	چھڑانا یا بھوک کے دن مین ناتے
ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِيْنًا	کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک
ذَا مَتْرَبَةٍ ،	مین پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا
(بلد-۱)	کھلانا،

۱؎ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، ۲؎ صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ وکتاب التفسیر،

عام قریش پر جنھون نے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہین سنا، عتاب آیا،

فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ	وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ،	ہے، اور غریب کے کھلانے پر آمادہ
(ماعون - ۱)	نہین کرتا،
كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ	یہ بات نہین، بلکہ بن باپ کے بچے کی تم
وَلَا تَحَاضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ،	عزت نہین کرتے اور آپس مین محتاج کے
(فجر - ۱)	کھلانے کی تاکید نہین کرتے،

اور مسلمانون کے اخلاص، باہمی ہمدردی، اور اُن کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی، کہ

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج
مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّأَسِيرًا ه	یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہین (اور
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا	کہتے ہین) کہ ہم تم کو صرف خدا کے لئے
نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا	کھلاتے ہین، تم سے نہ بدلا چاہتے ہین
(دھر - ۱)	نہ شکریہ،

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانون کو کسی قدر اطمینان ہوا، اور انھون نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ مین صدقۃ الفطر واجب ہوا[1]، یعنی یہ کہ سال مین ایک دفعہ

---

[1] تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۲۸۱،

عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ مین خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذارین، اس کے بعد مسلمانون کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی، انھون نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! ہم کیا خیرات کرین،

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، (بقرہ۔ ۲۷) — وہ پوچھتے ہین کہ وہ کیا خیرات کرین،

ارشاد ہوا

قُلِ الْعَفْوَ، (بقرہ۔ ۲۷) — کہدو (اے پیغمبر) کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ مین اسلام کا پہلا قدم ہے صحیح بخاری مین حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانون کو یہ حکم تھا، کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ مین خیرات کردین، آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھین[1]، کہ اس وقت اسلام اور مسلمانون کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنون کے بعد جب مسلمانون کو فتوحات نصیب ہوئین، زمینین اور جاگیرین ہاتھ آئین، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ (بقرہ۔ ۳۷) — اے مسلمانو! اپنی کمائی مین سے کچھ اچھی چیزین، اور جو ہم تمھارے لئے زمین سے پیدا کرین، اس مین سے کچھ خیرات مین دو،

[1] کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری جلد ۳ صہ ۲۱۶،

مسلمانون نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ، (بقرہ ۱-۱) اور ہم نے اُن کو جو روزی دی ہے اس مین سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہین

صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ مین کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بیقرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسرون کو بھی صدقہ دے، انھون نے پھر گذارش کی کہ جس مین اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انھون نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے یہی اس کا صدقہ ہے[۱]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتون کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ مین خرچ کرتے تھے[۲]،

لیکن باایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہین ہوا تھا، اور اس لئے اُس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ھ مین مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ مین منسلک کر دیا، اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، [۲] ایضاً،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال میں سے
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا	صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ
(توبہ - ۱۳)	سے تم ان کو پاک و صاف کرسکو،

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ مین زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب مین محصلون اور عاملون کا تقرر ہوا[1]، اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورۂ برأت مین مذکور ہین، جو ۹ھ کے آخر مین نازل ہوئی ہے،

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین مین بڑی افراط و تفریط تھی، توراۃ مین جو عُشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال مین ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل مین کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ مین سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا، کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ مین واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اُس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبون، مسکینون اور قابلِ امداد لوگون کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے اسلام نے اس معاملہ مین دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینون کا سال مقرر

[1] ابن سعد جلد مغازی ص۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۴ ص۱۷۲۲ مطبوعۂ یورپ،

کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصل سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے، اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلون کی صنعتی صورت کا بنانا اور اُن کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعون کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلین، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف، گذر جائین تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے، اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع، ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کرکے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانورون کی پیدائش اور نسل کی افزائش مین بھی اوسطاً ایک سال[1] لگتا ہے، ان تمام وجہون سے ہر منظم جماعت، ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعتِ محمدی نے بھی اس بارہ مین اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے، اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ مین موجود ہے، جس مین زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہین، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے،

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ	(توبہ-۵)	مہینون کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہین، جس دن اللہ نے آسمانون کو اور زمین کو پیدا کیا،

زکوٰۃ کی مقدار توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مین زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسوان حصہ تھا، اور نقد مین آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکسان فرض تھا، لیکن زمین کی مختلف قسمین

[1] بکری کی مدتِ حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ، اور بھینس کی بارہ مہینے ہے،

ہوتی ہین کہین زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے، اور کہین نہر کے پانی سے، جہان مزدوری اور محنت کا اضافہ ہوجاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہین، بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے، اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکسان حال نہین ہوسکتا، انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کردی، اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونون حقیقتون کو اپنے نظام مین جمع کرلیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دیدی، کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم وبیش جو چاہے خدا کی راہ مین دے دے، اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کردیا کہ ہر شخص کی دولت مین غریبون اور محتاجون اور دوسرے نیک کامون کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین فرمایا،

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ لا وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لا لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ لا ‏. (معارج - ۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین، اور جن کے مالون مین مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے،

اس آیت سے صاف وصریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانون کی دولت مین غریبون

کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین معلوم اور معلومات کے الفاظ جہان آئے ہین، وہان یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب مین جو قوم کسی کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اُس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب مین اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ مین مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس مین مقرر ہے، یعنی پیداوار مین دسوان حصہ، اور نقد مین نصف مثقال، آنحضرت صلعم نے اپنی حکمتِ ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحین مقرر فرمائین جو قیمت کے لحاظ سے اسی "شرحِ معلوم" کے مساوی ہین، اور ان شرحون کو فرامین کی صورت مین لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے، اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتبِ حدیث مین درج کیا گیا جو آج تک موجود ہین،

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآنِ پاک مین بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے،

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی، اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے،

عرب مین یہ دستور تھا کہ قبیلون کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سردارون کو مِرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قومون مین بھی یہ دستور ہو، ہندوستان مین مرہٹون نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکومون اور سپاہیون کے ساتھ زیادہ رعایت مدِ نظر تھی، اس لئے اُس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ ($\frac{1}{4}$) کے بجائے

دولت کا پانچوان حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور اُن کے بعد اُن کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانون کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد مین صرف کر سکین،

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خمس" ہے، قرآن نے کہا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اسکا
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ	پانچوان حصہ خدا کے لئے، اور رسول
وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	کے لئے، اور قرابت مند کے لئے
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال-۵)	اور یتیمون اور مسکینون اور مسافر کیلئے ہے

نکتہ، اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنون سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہین، اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ مین جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملیگا، اس کی طرف خود قرآن پاک مین اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثون مین اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی مین دشمنون سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانون کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس مین پانچوان حصہ نظام جماعت کا حق ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے،

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس مین سے پانچوان حصہ خدا اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف مین آئے، وہی ہے جس کی بنا پر "رکاز" یعنی دفینہ مین جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے، خمس (یعنی پانچوان حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے،

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس مین سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا تھا، شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسمون پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے اُن اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہین، تاکہ اُن سے حسب منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے، اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیون اور ترکاریون پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہین رہ سکتین، کوئی زکوٰۃ مقرر نہین فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس مین نشو و نما اور ترقی کی صلاحیت نہین مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، ہوا ری قیمتی پتھران پر بھی زکوٰۃ نہین رکھی گئی، کچھ دنون تک باقی رہنے والی اور نشو و نما پانے والی چیزین چار ہین، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکّے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چارون چیزون پر زکوٰۃ مقرر ہوئی،

زمین کی دو قسمین کیگئین ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے مین کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہین ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم

سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کوئین سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس مین قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسوان حصہ (۱/۲۰) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشو ونما، اور افزایش مین انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزایش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس مین ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسوان (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا[1]، (جانورون کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ مین شرح زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اُس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکون کو یہ چیز براہِ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہین، لیکن سونے چاندی کے مالکون اور تاجرون کی جو دولت ہے، وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام مین نہین آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہین، وہ کاشتکارون کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہین، جس سے ان کی دوسری ضرورتین پوری ہوتی ہین پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤن گاؤن، شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہین، اور اس کی بھی اُجرت ادا کرتے ہین، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے مین صرف ہوتی ہے، اس سے

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد مین بیان کیا ہے،

بدرجہا زیادہ نقد کے حصول مین صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیون کے فطری انقلابات کے بعد کہین پیدا ہوتی ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل مین انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گران تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینون کے مالک عموماً دیہاتون مین رہتے اور شہرون سے دور ہوتے ہین، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہین اس لئے نسبتہً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد مین اس "انفاق" یعنی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہین، جن کو عموماً نقد صورت مین دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہین، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ اُن کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرحِ مقدار کی تعیین مین اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہی کہ خمس مین چونکہ امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہین، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱/۵ مقرر ہوا، اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ مین مذکور ہین، صرف آٹھ ہین، اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرحِ مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ (یعنی ۱/۴۰) مقرر ہوا، یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ مین اِن آٹھ مصرفون کے لیے مجموعی رقم چالیسوان حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان ۲۰۰ دو سو درمون کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحین ۱/۵ و ۱/۱۰ و ۱/۲۰ و ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہین، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے،

جانورون پر زکوٰۃ توراۃ مین ہر قسم کے جانورون مین دسوان حصہ زکوٰۃ کا تھا لیکن چونکہ ہر قسم کے جانورون مین نسل کی افزایش کی صلاحیت اور مدت افزایش (زمانۂ حمل) یکسان نہین ہوتی نیز جانورون مین دسوین بیسوین کا حصۂ مشاع ہر تعداد پر چسپان نہین ہو سکتا، اس لئے ان مین دسوین بیسوین کے بجاے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدایش اور افزایش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانورون کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر، گھوڑے[1]، (یا ہندوستان مین ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہین، دوسرے جانورون کی مالیت اور قوت وکیفیت افزایش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا، اور زبانی نہین بلکہ فرامین کی صورت مین لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفاے راشدین نے اسی کی نقلین حدود حکومت مین بھجوائین، اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہین
"	۵ سے ۹ تک	ایک بکری
"	۱۰ " ۱۴ "	دو بکری

[1] احیاء، ۲ - ۲۳ ۔ حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑون مین زکوٰۃ ہے سواری اور جہاد کے گھوڑون مین نہین

نام جانور	تعداد	شرحِ زکوٰۃ
اونٹ	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریان
"	۲۰ " ۲۴ "	چار بکریان
"	۲۵ " ۳۵	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۳۶ " ۴۵ "	اونٹ کا دو سالہ بچہ،
"	۴۶ " ۶۰ "	تین سال کا اونٹ کا بچہ،
"	۶۱ " ۷۵ "	چار سال کا اونٹ.
"	۷۶ " ۹۰ "	دو سال کے دو بچے،
"	۹۱ " ۱۲۰ "	تین سال کے دو بچے،
"	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ،
"	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہین
"	۴۰ " ۱۲۰ "	ایک بکری
"	۱۲۱ " ۲۰۰ "	دو بکریان
"	۲۰۱ " ۳۰۰ "	تین بکریان
"	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہین،

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
گائے، بیل، بھینس	۳۰	ایک، دو سالہ بچھڑا،
〃	۴۰	تین سال کا ایک،
〃	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے،
〃	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا،
〃	۸۰	تین سال کے دو،
〃	۹۰	دو 〃 〃 تین
〃	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

غرض اصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ،

نصاب مال کی تعیین

شرح زکوٰۃ کے تعیین کے سلسلہ مین شرائع سابقہ مین ایک اور کمی تھی جسکی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کردی، جن دوسری شریعتون مین قانونی خیرات کی تعیین ہے، اُن مین امیر وغریب اور کم اور زیادہ دولت والون کی تفریق نہین کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپیے والون، یا دس پانچ گائے اور بکری والون سے یہ زکوٰۃ وصول کیجاتی، توان پر ظلم ہوتا، توراۃ مین غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے اس مین اس کا لحاظ نہین کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ مین تو یہانتک کہہ دیا گیا ہے کہ "خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب

کم نہ دے"۔ (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعتِ محمدیؐ نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبون، نادارون، مقروضون، اور اُن غلامون کو جو سرمایہ نہین رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہین، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والون پر بھی انکی اپنی حسبِ خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہین کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال[1] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اُوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سکّے ہین، یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے[2]،

وہ کم سے کم معیارِ دولت جس پر زکوٰۃ نہین حسبِ ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہین،
غلہ اور پھل،	پانچ وسق[3] سے کم پر زکوٰۃ نہین،
اونٹ ،	پانچ عدد " " "
گائے، بیل، بھینس،	۳۰ عدد " " "
بھیڑ بکری،	۴۰ عدد " " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہین،

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولہ کے، اور دو سو درم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے،
[2] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص ۱۶۳، اصح المطابع لکھنؤ،
[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہین
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہین

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحون مین جو یکسان زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے،

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہین، پانچ وسق غلہ، دو سو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا در حقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہین، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ مین چالیس درم[1]، یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ، اور پانچ وسق کی قیمت وہی دو سو درم یا ۲۰ مثقال ہوگی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان مین اصلاحات

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے مین خرچ کیجاتی تھی، (خروج ۳۰-۱۴) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونون اور گوشون مین کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائین، وہ غریبون اور مسافرون کا حصہ تھا، (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانورون کا دسوان حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور

[1] ہدایہ جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارۃ،

کھلائے، اور لاویون مین جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہین، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدے مین وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزین بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کر دیجاتی تھین کہ ان سے مسافرون، یتیمون، اور بیواؤن کو کھانا کھلایا جائے، (استثنا ۱۴-۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعتِ محمدیہ نے مذہب کی حقیقت مین سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱- وہ عبادت مین خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطون کا حذف کرنا تھا، یہان ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنون اور عبادت گاہون کے خادمون کی ضرورت ساقط ہو گئی، اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا، کلیۃً اڑگیا،

۲- عبادت مین سادگی پیدا کر کے ظاہری رسمون اور نمایشون سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانون، قربانی کے برتنون، اور محرابون کے طلائی شمعدانون کی ضرورت ہی نہین رہی،

۳- حج اُن ہی پر واجب کیا گیا، جن کے پاس زادِ راہ ہو، اس لیے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی،

۴- زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے مین صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات مین خرچ ہو گئی تو اس مین ایثار کیا ہوا،

۵- اس طرح وہ تمام سامان اور رقمین جو ان مدون سے بچین غریبون، مسکینون، اور مسافرون وغیرہ کو دے دی گئین،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعتِ محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ مین بعض اور اصلاحین بھی کی ہین، مثلاً

۶- شریعتِ سابقہ مین ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہین کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ مین جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غربا مین تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتین صرف کھانے تک محدود نہین ہین، اس لئے شریعتِ محمدیہ نے اس رسم مین یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دیجائے تاکہ وہ جس طرح چاہین اپنی ضروریات مین صرف کرین،

۷- ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعتِ محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمامتر مستحقین کے ہاتھون مین دیدیا،

۸- غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا، اور وہین سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزون ہو سکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم مین منتشر پیرو ون کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین مین صرف کیجائے،

۹- بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤن کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے، جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے، اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگون کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی، اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون کون لوگ

ہین، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیجا سکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتوین رکوع مین اس کا مفصل ذکر ہے۔

۱۰- اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کیجاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتادیئے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھون مین کھلونا بنجاتا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیون کی طرح یہ بھی ان کے عیش و عشرت کے پر تکلف سامانون کے نذر ہوجاتا، اس لئے تاکید کردی گئی، کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف مین خرچ ہوتی ہے،

۱۱- اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروون پر عائد کرتا ہے، تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوسکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور اُن کی اولاد (بنولاوی) کو ٹھرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیون کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، اور اپنے خاندان کے لیے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی،

۱۲- قرآن مجید مین زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے،

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ	زکوٰۃ کا مال تو غریبون، مسکینون
وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ	زکوٰۃ کے صیغہ مین کام کرنے والون

عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي
الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ
فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ
(توبہ -- ٨)

اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں
کو اسلام کی طرف ملانا ہے، اور گردنوں
چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اُن
میں اور خدا کی راہ میں، اور مسافر کے
بارہ میں، یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا
ہے، اور خدا جاننے والا ہے حکمت والا ہے
(اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)

فقرا میں ان خوددار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین، اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجتمند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِي
سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ
النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ -- ٣٧)

ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک
رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے
کیلئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے
نہ مانگنے کی وجہ سے انکو بے احتیاج سمجھتے
ہیں، تم ان کو ان کے چہرے سے پہچانتے
ہو، کہ وہ حاجتمند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر
نہیں مانگتے

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت، اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے چنانچہ اسی سورہ مین فرمایا،

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی	اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال
الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ	کی محبت کے باوجود) قرابت مندون،
وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ	یتیمون، مسکینون، مسافرون، مانگنے
وَفِی الرِّقَابِ ؕ	والون، اور (غلامون یا مقروضون
(بقرہ-۲۲)	کی) گردن چھڑانے مین مال دیا،

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ	کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے
فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَ	مان باپ، رشتہ دارون یتیمون
الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ	مسکینون، اور مسافر کے لئے،
السَّبِیْلِ، (بقرہ-۲۶)	

دوضرورتمندون مین ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندون اور رشتہ دارون کے دینے سے، اجنبی، بیگانہ اور بے تعلق لوگون کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگون کے دینے مین کچھ نہ کچھ نفسانیت کا، اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہین اور اُنکا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان

پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہین وہ تمامتر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہین، جو جتنا قریب ہی اتنا ہی زیادہ آپکے حقوق اُس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہین، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابتمندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہوجائین، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل و عیال کا، اُن کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال مین کچھ بچ رہے، تو اس مین حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہین، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم مین اسی اصول کی رعایت کیگئی ہی، یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت دارون کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبون کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا مین ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ دارون کی خبرگیری کرے تو کل انسانون کی خبرگیری ہوجائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہوجانا چاہیے، مستحقین مین باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزون پر ہے، ایک تو دینے والون سے ان اشخاص کے قرب وبعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتون اور ضرورتون کی کمی وبیشی، قرابتمندی کی ترجیح کے یہ معنی نہین ہین کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو اُن لوگون پر ترجیح ہے جن کی ضرورت، اور حاجتمندی ان سے کہین زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورتمند برابر کے حاجتمند ہون اور ان مین سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب؛ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت مین وہ اپنے عزیزون اور دوستون کو ترجیح دے،

فقراء اور مساکین مین سے ان لوگون پر جو بیحیائی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہین، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر وفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہین، لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہین جانے دیتے، اور لوگون کے سامنے ہاتھ نہین پھیلاتے ہین، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا "مسکین وہ نہین ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہین" صحابہ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے، ارشاد ہوا "وہ جس کو حاجت ہو، لیکن اس کا پتہ نہین چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہین[1]"،

اس تعلیم کے دو مقصد ہین، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والون کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، اور وہ کہین نہ کہین سے پا ہی جائین گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہین، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینون کی طرف ہونی چاہئے جو صبر وقناعت کے ساتھ فقر وفاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہین، کہ ان کی خبر بہتون کو نہین ہوسکتی، اور اکثر وہ امداد سے محروم رہجاتے ہین، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے، کہ بے حیا گداگرون کی عزت اس کی نگاہ مین نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال مین اس بیحیائی کو ناپسند کرتی ہے،

شریعت نے مصارف زکوۃ کی تعیین وتحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس وناکس اُس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحی الٰہی نے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ،

ان کی پردہ دری، ان الفاظ مین کی،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ	اور بعضے ان مین سے ایسے ہین جو تجھ کو
فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ	(پیغمبر کو) زکوۃ بانٹنے مین طعن دیتے ہین
لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ	اگر ان کو اس مین سے ملے تو راضی ہون
وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ	اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائین اور
وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ	کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے
سَيُؤْتِينَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ	جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا
رَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللّٰهِ رَاغِبُونَ	اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ہم کو اللہ
إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَ	اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے
الْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا	رہین گے، ہم کو تو خدا ہی چاہئے، زکوۃ
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ	تو حق ہے غریبون کا، مسکینون کا، اور اسکا
وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ	کام کرنے والون کا، اور ان کا جن کا
وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ	دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور
اللّٰهِ ۔	گردن چھڑانے مین، اور خدا کی راہ مین
	اور مسافر مین، یہ حصے خدا کی طرف سے
(توبہ ـ ۷، ۸)	ٹھہرائے ہوئے ہین،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوۃ کے مال مین سے کچھ پانے کی

درخواست کی، آپ نے فرمایا" اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم مین کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہین دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ مین رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہین، اگر تم ان آٹھ مین ہو تو مین تم کو دے سکتا ہون[1]"

اسلام مین زکوٰۃ کے مصارفِ ہشتگانہ

یہ آٹھون مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہین، فقرار اور مساکین مین وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہین جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہین رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کرسکتے ہین، لیکن موجودہ حالت مین دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت مین مصروف ہین، کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہین پاتے، جیسے مبلغین مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم، جو لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ مین اسی طرح داخل ہین جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک مین اصحابِ صفہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہین جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہین، اور فاقہ کرتے ہین،

وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا، یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس مین سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہین، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کیجائے) مین وہ لوگ داخل ہین، جنکو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے مین) اس سے مقصود وہ غلام ہین، جن کی گردنین دوسرون

---

[1] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی،

کے قبضہ مین ہین، اور اُن کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہین، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہین کرسکتے، وَالْغَارِمِيْنَ (تاوان اٹھانے والون) سے مراد وہ نیک لوگ ہین جنھون نے دوسرے لوگون اور قبیلون مین مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کیجا سکتی ہے، وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (خدا کی راہ مین) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کامون کو شامل ہے[1]، اور حسبِ ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی، یا سفرِ حج، یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جاسکتے ہین، اور وَابْنِ السَّبِیْلِ (مسافر) مین مسافرون کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافرون کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستون کی درستی، پلون اور مسافرخانون کی تعمیر بھی داخل ہوسکتی ہے[2]، یہ ہین زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن مین اسلام نے اس قومی ومذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینون، فقیرون اور معذورون کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگون کی امداد کیجائے، نادار یتیمون، بیواؤن اور اُن لوگون کی خبرگیری کیجائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان

---

[1] اکثر فقہا نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہین معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یہان فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہین، بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ مین تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، ہوسکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا،

[2] کتاب الخراج، قاضی ابویوسف، باب الصدقات،

نہین کرپاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریبًا ہر قوم مین اور ہر مذہب مین ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابلِ افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہین لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہین جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے،

غلامی کا انسداد غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلامون کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسنِ سلوک کی تاکید کی، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا، کہ اس سے غلامون کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلامون کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرِ فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہین کر سکتا تھا، اسلئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانون کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست مین نظر نہین آسکتی، پیغمبر اسلام علیہ السّلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانون کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرادی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اُس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہوجائین، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قومون سے خاتمہ نہ ہوجائے،

مسافر گذشتہ زمانہ مین سفر کی مشکلات اور دقتون کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بآسانی سمجھ مین آسکتا ہے کہ مسافرون کی امداد اور اُن کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی،

صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والون کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہین جو اپنے اہل و عیال، عزیز و قریب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہان سے کہان نکل جاتے ہین، اُن کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہین ہوتی، اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام و آسایش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائین، کنوین، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہین،

آپ کہہ سکتے ہین کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد مین یہ تمام مشکلین افسانۂ کہن اور داستان پارینہ ہو گئی ہین، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریان، بڑے سے بڑے بینک اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیان قائم ہو گئی ہین، اور سفر و حضر مین کوئی فرق نہین رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندون اور سرمایہ دارون کی راحت و آسایش کے لئے ہوا ہے، اور ان کے ان نئے طریقون نے پرانے طریقون کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہرون سے لیکر معمولی دیہاتون تک مین جہان امیر اور دولتمند مسافرون کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہین، وہان اس پورے مسیحی ملک مین حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کیلئے کہین سر رکھنے کی جگہ نہین کسی کی جیب مین جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چک نہین، اس کے لئے ہوٹلون اور اقامت خانون کے تمام دروازے بند ہین، کیا انسانیت کے لئے رحم ہے؟

کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکون کے طول و عرض مین جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامون کے قبضہ مین آئے، سراؤن، مسافر خانون، کنوؤن اور مہمان خانون کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤن مین بہ آرام و آسایش پہنچ جاتا تھا، اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اهلاً باهلٍ و اوطاناً باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا، اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکون مین جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہین ہین، غریب مسافرون کو وہی آرام و آسایش حاصل ہے، اور امرا، اور دولتمندون کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہان گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

منعم بکوه و دشت و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاه ساخت

جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ مین نہین بندھ جاتے، حقیقت مین جماعت کا وجود نہین ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہین، جماعت کے کمزورون، معذورون، اور مفلسون کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت مین اسکے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والون، اور مقروضون کی امداد کرنا، جماعت کے اُن کارکنون کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجا لائین، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے فرائض انجام دین، زکوۃ اسی نظام جماعت کا سرمایۂ دولت ہے،

زکوٰۃ کے مقاصد فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ زکوٰۃ کے اندر ہے، "زکوٰۃ" کے لفظی معنی "پاکی" اور "صفائی" کے ہین یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیون سے پاک و صاف ہونا، قرآن پاک مین یہ لفظ اسی معنی مین بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا، (شمس-۱)	مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا،

ایک اور سورہ مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، (اعلیٰ-۱)	مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا،

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی نبوت کی اُن تین عظیم الشان خصوصیتون مین سے ایک ہے، جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتون مین ہے،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ وجمعہ-۱)	وہ نبی خدا کی آیتین پڑھ کر اُن کو سناتا ہے، اور اُن کو گناہون سے پاک و صاف کرتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا ہے،

تزکیۂ نفس

ان آیتون سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی و صفائی کی اہمیت اسلام اور شریعتِ محمدی مین کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتون کا اصل مقصد ہے، انسانون کی روحانی و نفسانی بیماریون کے بڑے

حصہ کا سبب تو خدا سے خوف و رجا، اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے، اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے، لیکن دوسرا سبب، ماسوی اللہ کی محبت، اور مال و دولت اور دیگر اسبابِ دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ و بستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوہ مین عدمِ شرکت کا جرم صادر ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کرکے قرآن پاک مین ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً	ان کے مالون مین سے زکوٰۃ لے کر انکو
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا، (توبہ ۱۳)	پاک وصاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال مین سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ مین دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دور ہوجاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہوجاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہوجاتی ہے، دوسرون کیساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے شخصی خودغرضی کی بجاے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دیوارین ہین جن پر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآنِ مجید مین سود اور صدقہ مین جو حدِ فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي	خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا
الصَّدَقٰتِ، (بقرہ - ۳۸)	ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ درحقیقت سود مین نقصان اور صدقہ کے مال مین اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ اُخروی ثواب وگناہ اور برکت وبے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت مین اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کردیتا ہے، جس سے پوری قوم مفلس ہوجاتی ہے، اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہوجاتا ہے اور قومی صدقہ وعطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہوکر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ مین پڑجاتا ہے، تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہین ہلاتی، لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہوجاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہوجاتے ہین کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہین وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہوجاتے ہین کہ اُن کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص مین اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسرون کو قتل کرکے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کرکے اس کے تمام اصل ومنافع پر بیک دفعہ قبضہ کرلیتا ہے، لیکن صدقہ وخیرات دینے والا جو دوسرون کی دولت ناجائز طریق سے نہین لوٹتا، بلکہ خود دوسرون کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہین لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہرون کی منڈیان اور کوٹھیان اس عبرت انگیز واقعہ کی

پوری تصویر ہیں، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگِ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس[1]، تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے "تو انگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظوں میں یوں کہو، کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں، بلکہ صبر و قناعت کے بدولت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر، مزکی، اور مصلحِ اخلاق ہونے میں شبہہ ہو سکتا ہے؟

سود خوار کو دوسروں کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے، کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ اُن کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے، لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابلِ ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکیں،

باہمی اعانت کی عملی تدبیر زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن یہ

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس،

سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہلِ مذاہب کی شیرین کلامی سے دور نہین ہوسکتی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہین جنھون نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبون اور مسکینون کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینون ہی کے زمرہ مین میرا حشر کر" آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبون اور مسکینون کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری، اور اسلام کے معرکون کے مخلص جانباز تھے، آپ کی نظر مین کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ "مبارک ہین وہ جو دل کے غریب ہین، کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُنھی کی ہے[۱]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا،

ان المکثرین ھم المقلون[۲]، جو دولتمند ہین وہی غریب ہین،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہین وہی دولتمند ہون گے،

پھر انھین خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہین دینا ہے) دولت والون سے ۴۰ سال پہلے جنت مین داخل ہونگے[۳]،

---

[۱] متی ۵-۳ [۲] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ہم المقلون، [۳] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغنیائہم،

اسلام نے ان روحانی تسلیون اور بشارتون کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کی عملی تدبیرین ہین، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہین رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیرین اختیار کین، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے، جس کا نام قرآن کی اصطلاح مین "انفاق" ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہین کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ اداکرنا اس کا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبون اور محتاجون کی امداد واعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلعم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابلِ تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لیے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی، کہ

توخذ من اغنیاء ھم وترد	وہ ان کے دولتمندون سے لے کر
علیٰ فقرا ئِھم[۱]،	ان کے غریبون کو لوٹا دیا جائے،

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونون قسمون کی خیراتون پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب ومعذور بھائیون کی اخلاقی اعانت مین خرچ کرین، اور اس معاملہ مین خود آپ نے

---

[۱] صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیۃ

یہان تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا "اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے"۔ اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی،

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا	تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو
السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ، (ضحیٰ-۱)	جھڑک،

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو، کہ وہ منت پذیر ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائیگا، فرمایا،

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ	تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ
وَالْاَذٰى، (بقرہ-۳۶)	دے کر برباد نہ کرو،

اس لطف، اس مدارات، اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابلِ رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا، تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانون کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہو، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہو کہ مسلمانون مین اگر امیر کم ہین تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہین، جیسے دوسری قومون مین نظر آتے ہین، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے

مسلمانون کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت مین ہے، اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بیماریون کا علاج

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب مین ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہین جن مین نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کی گئی، اور نہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو نامنفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذہب ہین جنمین دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر مین دولتمندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہین پاسکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ مین لٹا نہ دے، انجیل مین ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب مین فرمایا،

"اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال، اور محتاجون کو دے، کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا، تب آکے میرے پیچھے ہولے۔"

وہ دولتمند یہ تعلیم سُن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل مین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

"مین تم سے سچ کہتا ہون کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ مین تم سے کہتا ہون کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے، کہ دولتمند خدا کی بادشاہت مین داخل ہو۔" (متی ۱۹ - ۲۱ - ۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگون کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے، اور ہر قسم کی دولت سے پاک

رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگون کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہون تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگون کے دروازون پر کھڑے ہو جائین لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونون طریقون کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسرون کی طرف منتقل کر دینا، اُن کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی، اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسرون کو دے کر خود اسی حال مین پہنچانا کہان کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اسلئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکسان مفید نہین ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولتمندی دنیا مین ہزارون سیہ کاریون کی محرک ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزارون جرائم کا باعث ہے، اور ان دونون خرابیون سے انسانون کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت، اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد، اور خیر و شر دونون صفتون سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت، اسلام کی نگاہ مین خدا کی ایک نعمت ہے، لعنت نہین، ہنر ہے، عیب نہین، خیر ہے، شر نہین، چنانچہ قرآنِ پاک مین متعدد موقعون پر دولت کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ مین دے دین، آپ نے فرمایا کہ "تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگون کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرین [1]" آپ کے حلقہ بگوشون مین دولتمند بھی تھے، اور

[1] بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس،

غریب بھی، اور دونون آپکے دربار مین برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبون نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہین، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہین وہ وہ بھی کرتے ہین، اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہین، جو ہم نہین کرپاتے، آپنے انکو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیون نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبون نے پھر جاکر عرض کی، تو آپنے فرمایا "یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے"[لہ]

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا مین ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا، اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کردیا، ایک دفعہ آپنے تقریر مین فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمھاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے" صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟ فرمایا "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا "یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟" سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہوسکتی ہے آپنے سوال سنکر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پوچھے، پھر فرمایا "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع مین آکر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہین تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہوجاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہوجاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینکدیتا ہے، اور پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو

[لہ] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ،

شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہین کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے، اور سیر نہین ہوتا۔[1]

اس تقریر مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہین ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کیجائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کیجائے تو وہ نیکیون اور بھلائیون کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہین تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونون کے لئے یکسان ہین، ایک سخی و فیاض و متواضع امیر، اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر مین فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہین، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہین، اسلیے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولتمندون کے اخلاق کی اصلاح کیجائے اور دوسری طرف غریبون اور فقیرون کی امداد اور دستگیری کے ساتھ انکے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام مین زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے،

اس سلسلہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقون، دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہین کی، اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبون کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ و کتاب الزہد والرقاق باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا،

لوٹنے کے سبب عام طریقہ "سود" کو حرامِ مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین
یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی،
چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہین، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے
وہ اسی کی ہے"۔ (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہین، بلکہ بقدر استحقاق
تمام عزیزون کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالکِ مفتوحہ کو امیرِ اسلام کی شخصی ملکیت نہین، بلکہ پوری
جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششون کو جو انسانی محنت کی ممنون نہین، جیسے
پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف مین دیا، اور ان
لڑائی کے دشمنون سے حاصل کی ہوئی زمینون کو امرا اور دولتمندون کے بجائے خاص غریبون
اور بیکسون کا حق قرار دیا، اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی،

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ	بستیون والون کی ملکیت سے اللہ
اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ	جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ
وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	خدا اور اس رسول اور رشتہ دارون
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ	اور یتیمون اور غریبون اور مسافرون
كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ	کا حق ہے، تاکہ وہ الٹ پھر کر تم مین سے
الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ	دولتمندون ہی کے لینے دینے مین نہ
(حشر-۱)	رہ جائے،

اس کے بعد اس سلسلہ مین دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا مین انسانیت کا

بدترین مظہر اور آخرت مین بڑی سی بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا،

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (حشر-۱)	وہی لوگ ہین مراد پانے والے،

بخل کا مبتلا دوسرون کے ساتھ بخل نہین کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا مین اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام وراحت تک سے اور آخرت مین ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ	اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی
نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ	سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور
الْفُقَرَآءُ ، (محمد-۴)	تم ہی محتاج ہو،

اس آیتِ پاک مین درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمھاری نہین، اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت مین سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیون اور بدیون کی جڑ ہے، اس آیتِ پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے،

پھر دولت کے ان مجازی مالکون اور امینون کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت مین اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا،

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ	پھر اس دن تم سے تمھاری نعمت کا
النَّعِيمِ، (تکاثر-۱)	حساب پوچھا جائے گا،

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے، کہ وہ اپنی دولت کو کہان اور کس طرح صرف کرتے ہین، ان لوگون کو جو اپنے روپے کی تھیلیون کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہین تنبیہ کی،

وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ	برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا، اور عیب
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ	چنتا ہو، جو مال کو سمیٹ کر رکھتا ہو،
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ	اور اس کو گن گنکر، وہ خیال کرتا ہی کہ
كَلَّا، (همزہ-۱)	اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہیگا،
	ہرگز نہین،

فرمایا "رشک کرنا صرف دو آدمیون پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ مین خرچ کرتا ہے[1]" جو لوگ سونے چاندی کو زمین مین گاڑ کر رکھتے ہون اور کار خیر مین خرچ نہ کرتے ہون، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ	وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر

[1] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ،

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا | رکھتے ہین، اور اس کو خدا کی راہ مین خرچ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ | نہین کرتے، اُن کو دردناک عذاب
بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (توبہ-۵) | کی بشارت دیدو،

اس آیتِ پاک نے صحابہ مین دو فریق پیدا کردیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ مین خرچ کردینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت مین عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت مین جو حق واجب ٹھہرایا ہے، (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہین، لیکن اہلِ رازِ صحابہ اور علماے امت نے اپنے قول وعمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی، حضرت موسیٰؑ کی توراۃ مین مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہین اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل مین آسمانی بادشاہی کی کنجیان اسی کے حوالہ کی گئی ہین جو سب کچھ خدا کی راہ مین لٹا دے، یہ دونون تعلیمین اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہین، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندون کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانون کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کرسکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونون شریعتون کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کردیئے، ایک قانونی، اور دوسری اخلاقی قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت مین ملحوظ تھی، یعنی نصف مثقال نقد

ہین اور عشر پیداوار ہین، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے، جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحبِ نصاب پر واجب ہے، اور اس کا وصول اور خرچ کرنا، جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جسکو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانون کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ مین دونون قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ[1]، اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدمون پر لاکر ڈال دیتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ[2]، اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ مین بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ[3]، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسرون کو کھلا دیتے تھے، اور خود تکلیف اٹھا کر دوسرون کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علیِ مرتضیٰؓ، اور بعض انصارِ کرام، خدا نے اُن کی مدح فرمائی،

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود
مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا،	اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو
(دھر - ۱)	کھلا دیتے ہین،
وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ	اور وہ اپنے آپ پر دوسرون کو ترجیح
وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ (حشر-۱)	دیتے ہین، اگرچہ وہ خود حاجتمند ہون،

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰۃ فلیس بکنز، [2] ترمذی کتاب المناقب فضائلِ ابی بکر، [3] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶،

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتون کے موافق، اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے، جس سے اہلِ حاجت اور نیک کامون کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہلِ دل اور اہلِ استعداد کے مرتبۂ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے، اور اس کی خوبیان اور بڑائیان بھی بیان کر دی ہین، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپرون سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرین،

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات مین اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ مین فرماتے ہین،

واین طائفہ جان ومال در باختہ اند	اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے
وبا ہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند،	اور خدا کے سوا کسی سے دل نہین لگایا ہے
گفتۂ ایشان است الفقیر مالہٗ	اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جسکا
مباح ودمہ ھدر یعنی درویش	مال وقف اور جس کا خون معاف ہو،
صادق آن بود کہ بجزن ومال اورا	اس کو اپنی جان ومال پر کوئی دعویٰ نہ ہو
دعویٰ نہ بود. . . . . . . اگر	. . . . اگر لوگ اسکا
مالش بر ندخوش گردد، گویدالحمدللہ	مال اٹھا لیجائین تو خوش ہو کہ الحمدللہ
کہ حجابے از پیش من بر داشتند تا گفتہ اند	اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ

زکوٰۃ نعمتِ دنیا نزدیک این طائفہ
محمود نہ باشد از آنکہ بخل ناستودہ است،
و بخلی تمام باید تا دویست درم را در بند
کند، و یکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج
درم از ان بدہد،

پڑا تھا وہ اٹھ گیا، یہانتک کہ ان کا کہنا یہ
ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کرکے زکوٰۃ
دینا کچھ اچھا نہیں ہے، کیونکہ بخالت تعریف
کے قابل نہیں، اور اس کے لئے کہ سال
مین دو سو درم جمع ہوں، اور پھر وہ ایک
سال تک بند پڑے رہین، تب جا کر ایک
سال کے بعد پانچ درم ان مین سے خدا کی
راہ مین دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے،

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے،

یکے از فقہاء برسبیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ
علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید؛
گفت جواب بر مذہب فقیہان خواہی
یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو
جواب فرما، شبلیؒ گفت، بر مذہب فقیہان
از دویست درم بعد از حولانِ حول؛
پنج درم باید داد، و بر مذہب فقیران در
حال ہر دویست درم باید داد و جان

کسی نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ
کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہاء کے مسلک پر
جواب چاہتے ہو، یا فقراء کے، کہا دونوں
کے، فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق ایک
سال گذرنے پر دو سو درم مین سے پانچ
درم، اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے
کے پورے دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی
مین اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی

بشکرانہ برسر باید نہاد، فقیہ گفت ما	چاہئے، فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ
ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم	دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ
شبلیؒ گفت ما ایں مذہب از صادقِ	مسلک صدیق اکبر سے حاصل کیا ہے،
رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق	کہ جو کچھ تھا وہ سب سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ
رضی اللہ عنہ او ہرچہ داشت پیش	وسلم کے سامنے رکھدیا، اور اپنی جگر گوشہ
سیّدِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نہاد و جگر گوشہ	(حضرت عائشہ رضہ صدیقہ) کو شکرانہ
خویشتن بشکرانہ داد، (مکتوب ۱۱۷۔ سہ صدی)	مین دیا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہلِ استحقاق مین تقسیم ہو جاتا، اگر گھر مین رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر مین آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہین قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبون اور دولتمندون کے ہر طبقہ کے لئے یکسان کھلا رہے، اور اس لئے تاکہ بے قیدی وعدم پابندی لوگون کی سستی اور عدمِ عمل کا باعث نہ ہو، مقدارِ معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے،

اشتراکیت کا علاج

دنیا مین امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور مین قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے

پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقے نہایت دولتمند ہو جاتے ہین جن کے خزانون کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہین ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہین، جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا، اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہین ہوتی اور دولتمند طبقون کی خودغرضی، خودپسندی، عیاشی، اس حدتک پہنچ جاتی ہے، کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیون کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہین ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہین کہ یہ اتفاقی دولت، خدا کی طرف سے نہین بلکہ ان کے علم وہنر، سعی وکوشش اور دست وبازو سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس مین کوئی حصہ نہین، قارون کو جب زکوٰۃ وخیرات کا حکم ہوا، تو اُس نے جواب مین یہی کہا،

اِنَّمَآ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ ؕ (قصص - ۸)   مجھکو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے، یہ سب ملا ہے،

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونون کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے،

یونان کے آخری دور مین یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ مین یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا مین یہی آب وہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہین، لیکن دنیا مین مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے، یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے، جو نقشے بنا رہے ہین، وہ انسانی فطرت وطبیعت کے اس درجہ مخالف ہین، کہ ان کی دائمی کامیابی صد درجہ مشکوک ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں مین جانے سے روکا جائے سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہین دیا، نفع عام کی چیزین اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دین، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے، جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس مین کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہین کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانون مین برابر تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا مین کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیون کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا، کہ وہ اس رقم سے قابلِ اعانت لوگون کی دستگیری کرے یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتون سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک مین اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ مین جتنے مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہین ہو سکتے، خلافتِ راشدہ کے عہد مین حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے، جب عرب مین دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام مین قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہین اور خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے"۔ یہ فتویٰ دیا کہ

دولت کا جمع کرنا حرام [1] ہے، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ مین دیدے، اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ مین دیکر بچاتے ہین تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی، اور نہ عوام مین کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسایش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ مین کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہین [2] رہا،

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ مین ان روحانی اور اخلاقی فائدون کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہین، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ ان ہی چیزون مین واجب ہوتی ہے، جن مین دو صفتین پائی جائین، یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکین کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت مین تو چندان فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسرون کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لیے سبزیون اور ترکاریون پر زکوٰۃ نہین ہے، اور نمو سے یہ مقصد ہے، کہ ان مین یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزایش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھرون مین یا غیر مزروعہ زمین اور مکان مین بھی زکوٰۃ نہین ہے، ان دونون نکتون سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھین، بلکہ محنت، کوشش اور جد و جہد سے اس کو ترقی دین ورنہ اصل سرمایہ مین سال بسال کمی ہوتی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۷۶، [2] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۴ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶،

جائے گی، جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہین کرسکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہین ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال مین ایک خاص رقم ادا کرنی پڑیگی تو وہ کوشش کریگا کہ جہان تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے، اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان ہی چیزون کے ساتھ مخصوص کیا جن مین نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھاسکے، صحابۂ کرام اس نکتہ کو سمجھ ہمیشہ تجارت اور کاروبار مین مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت مین ان لوگون کو جو یتیمون کے سرمایون کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت مین لگائین تاکہ اُن کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ مین سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہان مال کا اکثر حصہ بیکار زمین مین مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتادیا تھا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑکر
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ	رکھتے ہین، اور اس کو خدا کی راہ مین نہین
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	صرف کرتے، ان کو سخت دردناک
اَلِيْمٍ، (توبہ - ۵)	عذاب کی بشارت دو،

یہ دردناک عذاب قیامت مین تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا مین بھی ان کے لئے

اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہین، اور اس سے دولت کی افزایش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے، اس کو بےکار اور معدوم کرکے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم مین مبتلا کرتے ہین، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہین، اس لئے امرار کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی مین ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کرین،

فقرار کی اصلاح

اب دوسری طرف فقرار کا گروہ ہے، اس مین کوئی شک نہین کہ دنیا کے تمام شارعینِ مذاہب نے انسانون کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اُس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اُس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے، کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جرّاح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتون سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا،

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس مین افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم مین صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہین رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب مین سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب مین اس زخم کو سرتاپا مادۂ فاسد بننے دیا گیا ہے، اور بھکشوؤن کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جرّاح کی طرح دونون عمل کئے ہین، اس نے اس غمگین اور

درد مند طبقہ کے زخم مین نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیان تسلیان، بشارتین اور عملی امداد و اعانت کی تدبیرین ہین، جو اس کے دل کی ڈھارس، اور اسکی اُمیدون کا سہارا ہین، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہین، جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسرون کی دست نگری، اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کین، اس نے اہلِ حاجت کے لئے دوسرون سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہین کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور اُن کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے،

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب مین ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبون اور مسکینون کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندون کو سب کچھ غریبون اور مسکینون کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہین، اور اس سے دینے والون کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہین، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہین، اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہین، اس طرح اُن کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہین، جہان یہ تمام نجاستین آکر جمع ہوگئی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوعِ بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم

کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہین ہوئی، وہ انسانون کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہین، غریب و امیر اور مسکین و دولتمند دونون آپ کی نگاہ مین یکسان ہین، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہین دیا، بلکہ دونون طبقون کو ترازو کے دونون پلڑون مین رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات مین سے دونون کو مساوی حصّہ دیا ہے،

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیون کے خاتم اور دینون کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ مین ترازو کے دونون پلون کو برابر رکھ سکا، اگر غریبون کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسرون کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بند کردئیے جائین، تو انسانی جوہرِ شرافت کی بربادی کیساتھ امراء کا طبقہ معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک، اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائیگا، اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدیجائے تو انسانون کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی، اسی لئے داعیِ اسلام علیہ السّلام نے انسانون کے دونون طبقون کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونون طبقون کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونون کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریون کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندون کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا،

اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ، (ضحیٰ-۱)	مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خود دار و بے نیاز فقرا اور غریبون کے طبقہ کی مدح فرمائی،

یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ	ناواقف اُن کی خودداری اور سوال کی
التَّعَفُّفِ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ لَا	ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند
یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا،	سمجھتا ہے، تو ان کو ان کی نشانی سے
(بقرہ ۳۷)	پہچانتا ہے، وہ لوگون سے لپٹکر نہیں مانگتے

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے اُن کو خطاب کر کے کہا،

وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَیۡرَ الزَّادِ	اور زادِ راہ لے کر چلو کہ بہترین زادِ راہ
التَّقۡوٰی، (بقرہ-۲۵)	تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے،

ایک طرف دولتمندون کو فرمایا کہ تمھارا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی مت لوٹاؤ، وَلَوۡ بِشِقِّ تَمۡرَةٍ "اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیون نہ ہو[1]" دوسری طرف فقیرون کو فرمایا کہ تمھاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ[2] اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانون کے دونون طبقون کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونون کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلۃ،

بہم پہنچایا،

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والون کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے، لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلوؤن سے لیکر پینے لگتے ہین، اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا،

ان ھذہ الصدقات انما   یہ صدقہ تو لوگون کا میل ہے،

ھی اوساخ الناس[1]،

اگر آج اُن فقیرون اور گداگرون کی صورتون اور سیرتون پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہین تو نظر آجائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگون کے دلون کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے،

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتین جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہین، ان مین سے کونسی چیز ہے، جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء، اور مہذب گداگرون کا تمغائے امتیاز نہین، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والون کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگرون کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض وقعہ قدرۃً ایسی مجبوریان پیش آجاتی ہین جب نفیس سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کیلئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ،

کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے، شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگون کو اسکے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گرہ کے اخلاق وعادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہین اُن کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہین، اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہین جن کی تفصیل حسب ذیل ہی،

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے، نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع مین اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی، اور دنارت ظاہر ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے، یا ان مین بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہون، وہ اپنی نظر مین اپنی ذلت آپ محسوس کر کے، اپنی جان پر کھیل نہ جائین،

اسلام نے اِنہی باتون کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والون کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ	ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہین، ہم
لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا، (دھر-۱)	تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہین چاہتے،

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمھاری احسان مندی اور شکر گذاری بھی نہین

چاہیے، پھر صدقہ دینے والوں کو یہ بھی تصریح بتادیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے، یا لینے والے کو ذلیل ورسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہوجائیگی اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا،

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو لوگ خدا کی راہ مین اپنا مال خرچ کرتے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ	ہین اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّهُمْ	ہین، نہ طعنہ دیتے ہین، ان کا اجر انکے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	خدا کے پاس امانت ہے، اور نہ ان کو
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝	قیامت مین کوئی خوف ہے، اور نہ وہ
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ	غمگین ہونگے، کچھ نرمی کی بات کہکر اور
صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی وَاللّٰهُ	چشم پوشی کرکے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ
غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ۝	سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے
	یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی
	خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے
(بقرہ - ۳۶)	کاموں پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے

اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے ایک دلنشین تشبیہ سے واضح کیا ہے،

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	مسلمانو! اپنے صدقون کو احسان جتا کر
صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی	اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	اپنے صدقون کو برباد کرتا ہے جو شخص
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	لوگون کے دکھلانے کو دیتا ہے، اور
الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ	خدا پر اور قیامت پر ایمان نہین لاتا،
عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ	اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ	کی ہے، جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو، اور
عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ	اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو، جس نے
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ.	اُس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اُس پر
	کوئی چیز جم نہین سکتی ہے، ان لوگون
	نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہین
	اٹھا سکے، خدا کافرون کو ہدایت یاب
(بقرہ - ۳۶)	نہین کرتا،

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دین، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال مین جمع کرین، اور وہ امیر حسبِ ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بنکر اپنی ذلت نہ محسوس کرے، اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرار اور معذورون کو دربدر کی ٹھوکر کھانے

کی رسوائی، اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے

۲- اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بیحیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے، کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقروفاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی، اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ، دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بنجائے گا، اور یہ اخفاء اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا، نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکیگا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو[1]۔

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا	اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے
هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا	لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ ۳۷)	بہت ہی بہتر ہے،

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقہ،

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفار کو عام خیرات کیساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسرون مین اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہین لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہدِ نبوی مین تھا یعنی کیہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملون کے سپرد کیجائے، اس لئے اخفار کا جو فائدہ فقرا کے حق مین ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیرون کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لئے جس آیت مین اعلان کی اجازت ہے، اس مین فقرا کو براہِ راست دینے کا حکم نہین، اور جہان اخفا کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہان فقرا کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفار کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہین ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ مین ہے، کہ اگر بیت المال جس اور تابعین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونون کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہِ راست مستحقین کو دینا پڑے جس مین حساب کتاب کی ضرورت نہین، اور براہِ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے بیت المال کا پردہ بیچ مین نہین ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمایش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے

کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے مین اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکرون کی ضرورت ہو، ورنہ صحابۂ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کیلئے جبتک اخبارون کے پورے کالم سیاہ نہ کردیئے جائین دینے والون کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہین ہوتی؛

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام چیزین ہیچ نظر آئین، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ مین مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنی درجہ کی چیزون کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھوپن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اُس کے لالچ سے نہین بچ سکتی، اور دوسری طرف دینے والے کی رُوح مین بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دیدینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہین ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحنِ خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل مین صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتون مین ہے کہ اصحابِ صفہ کو جنھون نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسبِ معاش کا موقع نہین ملتا تھا، اسلئے لوگ کھجورون کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدون مین لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی

شدت سے بیتاب ہو جاتا تھا، تو مجبوراً ان مین سے دو چار کھجورین توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ،	مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمھارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان مین سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے، لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور یقین کرو کہ خدا تمھاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے، اور وہ خوبیون والا ہے
(بقرہ-۳۷)	(خوبیون ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۴- فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان ہی لوگون کو زکوۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہین دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خواہ مخواہ ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام مین سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا، کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز اُن کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہین کر سکتی تھی، اس بنا پر اسلام نے اُن کو زکوۃ کا بہترین مستحق

قرار دیا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا،

(بقرہ - ۳۷)

صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ مین گھرے ہوے ہین (بغرض معاش و تجارت) سفر کی قدرت نہین رکھتے، جو لوگ ان سے ناواقف ہین خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہین، تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگون سے گڑگڑا کر کچھ نہین مانگتے،

آج مسلمانون نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑون شریف آدمی در در کی ٹھوکرین کھاتے ہین، اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہین۔

۵- لیکن باین ہمہ حزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہی اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت مین اس کی اجازت دی، اور جہانتک ممکن ہوا لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم نے بعضون سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہین مانگین گے، انھون نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ مین اگر ان مین سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہین کہتے تھے، کہ اٹھا دو[ل]، ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص

[ل] ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراہیۃ المسئلہ،

مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگیگا نہین تو مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون، آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے مین یہ ضمانت کرتا ہون، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہین مانگتے تھے،[1]

حکیم بن حزام ایک صحابی تھے، انھون نے ایک دفعہ آنحضرت ؐ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوشرنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کیساتھ لے گا اس کو اس مین برکت دی جائیگی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ملے گی، اور اس کی حالت ایسی ہو گی جیسے کوئی کھاتا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ آج سے مین پھر کسی سے کچھ نہ مانگون گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے،[2]

اس کی اور متعدد مثالین ہین، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگون کے لئے جو صاحبِ دست و بازو ہون یعنی جن کے ہاتھ پاؤن، اور آنکھین صحیح و سالم ہون بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

لا تحل الصدقۃ لغنی ولا	غیر محتاج اور صحیح و سالم آدمی کے لئے
لذی مرۃ سوی (ترمذی کتاب الزکوۃ)	صدقہ حلال نہین،

صحیح بخاری مین ہے کہ آپ نے فرمایا،

---

[1] ابو داؤد کتاب الزکوۃ باب کراہیۃ المسئلہ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ،

والذی نفسی بیدہ لان	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین
یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب	میری جان ہے، کہ تم مین کسی کا رسی لیکر
علی ظہرہ خیر لہ من ان یاتی	اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے
رجلا فیسألہ اعطاہ او منعہ	بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک
(کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ)	مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے،

آنحضرت صلعم نے اپنے زمانہ مین اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی آپنے فرمایا تمھارے پاس کچھ ہے، عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپنے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور بیچو، انھون نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کیلئے بچگئے[1]

۶- لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسبِ معاش نہین کرسکتے، ان کو بھی الحاح، کثرتِ سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپنے فرمایا،

لیس المسکین الذی تردہ الاکلۃ	مسکین وہ نہین ہے جس کو لقمہ دو لقمے
والاکلتان ولکن المسکین الذی	دروازون سے واپس لوٹا دیتے ہین،
لیس لہ غنی ویستحی ولا یسأل	مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہین ہے،
الناس الحافا، (بخاری کتاب الزکوۃ	لیکن حیا کرتا ہے، اور لوگون سے
باب قول اللہ عزوجل لا یسئلون الناس الحافا)	گڑگڑا کر نہین مانگتا،

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ

[1] ابوداؤد کتاب الزکوۃ،

ہر حال مین انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کردیتا ہے، فرمایا،

مازال الرجل یسئل الناس	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہانتک
حتیٰ یاتی یوم القیامۃ لیس فی	کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئیگا
وجہہ مضغۃ لحم، (بخاری	کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا
کتاب الزکوٰۃ باب من سال الناس تکثرا)	نہ ہوگا،

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا مین مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھو دی تھی،

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیون اور بداخلاقیون کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانون مین پیدا ہو سکتی تھین، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونون طبقون کو ترازو کے پلڑے مین برابر رکھ کر، ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کردیا، پست وبلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کردیئے، اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلون سے اس کو ڈرایا کرتی ہے،

آنحضرت صلعم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہؓ مین یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیون مین یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازون تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے

سوا دوسرون کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت صلعم کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال مین اتنا سرمایہ رہتا تھا، کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہین ہوتی تھی، ضرورتمندون کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا[۱]، اس طرح یہ ایک ایسا مالی واقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے مین افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر داد وستد کا راستہ کھلا ہوا تھا،

۱؎ تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۶۸۱،

روزہ

کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی مین اس کو "صوم" کہتے ہین، جس کے لفظی معنی "رکنے اور چپ رہنے" کے ہین، بعض مفسرین کی تفسیرون کے مطابق قرآن پاک مین اس کو کہین کہین "صبر" بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی "ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال" کے ہین، ان معنون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان مین روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشون سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعون مین اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال مین عام طور سے نفسانی خواہشون اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزین ہین، یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدتِ متعینہ تک رُکے رہنے کا نام شرعًا روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشون کے ساتھ باطنی خواہشون اور برائیون سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی، خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت مین داخل ہے،

روزہ کی ابتدائی تاریخ

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہین، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصولِ معاشرت) مین چند وحشی قبائل کی تمثیل اور

استقرار کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتدا اصل مین اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ مین، خود بھوکے رہتے ہونگے اور سمجھتے ہونگے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردون کو پہنچ جاتا ہے"، لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ مین سند قبول حاصل نہ کرسکا،[1]

بہرحال مشرکانہ مذاہب مین روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہون، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح مین اپنے پیرون کی وکالت کا محتاج نہین، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ ۲۳)
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ
فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ ط وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا
أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ
أُخَرَ، يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ
وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا

مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض
ہوا، جس طرح تم سے پہلی قومون پر
فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار بنو،
ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس مین قرآن
اتارا گیا، جو انسانون کے لئے سرتاپا
ہدایت، ہدایت کی دلیلین اور حق و
باطل مین فارق بنکر آیا، تو جو اس رمضان
کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے،
اور جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو، وہ دوسرے
دنون مین رکھ لے، خدا آسانی چاہتا
ہے، سختی نہین، تاکہ تم روزون کی تعداد

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ ص ۱۹۴ طبع ۱۱

الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى	پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لئے فرض
مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ	ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اسکی
تَشْكُرُوْنَ ، (بقرہ - ۲۳)	بڑائی کرو، اور تاکہ تم شکر بجا لاؤ،

ان آیاتِ پاک مین نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، "روزہ کی حقیقت" رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہین، ذیل کے صفحات مین بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہین،

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآنِ پاک نے ان آیتون مین تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہین بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزء رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبرِ امی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب مین روزہ فرضِ عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع مین کیا شک رہجاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق مین یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہین؛

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے :-

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب وہوا، قومیت وتہذیب، اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہین، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہین جس کے مذہبی نظام مین روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔"

آگے چل کر لکھتا ہے،

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہین، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنون پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال مین چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ مین ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہین، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہین یعنی چالیس دن تک اکل وشرب سے احتراز کرتے ہین، ہندوستان کے تمام مذاہب مین جینی دھرم مین روزہ کے سخت شرائط ہین، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہان ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات ودکن مین ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہین، قدیم مصریون کے ہان بھی روزہ دیگر مذہبی تہوارون کے شمول مین نظر آتا ہے، یونان مین صرف عورتین تھسموفریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھین، پارسی مذہب مین گو عام پیرودن پر روزہ فرض نہین، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم اُن کے ہان موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤن کے لئے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا،[۱]

یہودیون مین بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے (خروج، ۳۴، ۲۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی مین چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے تھے لیکن چالیسوین دن کا روزہ اُن پر فرض ہے، جو ان کے ساتوین مہینہ (تشرین) کی دسوین تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشورا (دسوان) کہتے ہین، یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس مین حضرت موسیٰؑ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے، اسی لئے تورات مین اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے[۲]، اس کے علاوہ یہودی صحیفون مین اور

---

[۱] ان تمام حوالون کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴ طبع یازدہم، [۲] توراۃ سفر الاحبار ۱۶-۲۹-۳۴ و ۲۳-۲۷،

دوسرے روزون کے احکام بھی تبصریح مذکور ہین[1]،

عیسائی مذہب مین آکر بھی ہم کو روزون سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس[2] دن تک جنگل مین روزہ رکھا[3]، حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے گویا مبشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اوران کی امت بھی روزہ دار تھی[4]، یہود نے مختلف زمانون مین مختلف واقعات کی یادگار مین بہت سے روزے بڑھالئے تھے اوروہ زیادہ ترغم کے روزے تھے، اوراس غم کوظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنالیتے تھے[5]، حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اپنے زمانے مین غم کے ان مصنوعی روزون کو منع کردیا، غالبًا اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیون نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیون روزہ نہین رکھتے، حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب مین فرمایا،

"کیا براتی جب تک دولھا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہین، جب دولھا ان کے پاس ہے روزہ نہین رکھ سکتے' پروہ دن آئین گے کہ جب دولھا ان سے جدا کیا جائے گا' تب ان ہی دنون میں روزہ رکھین گے،" (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح مین دولھا سے مقصود خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود انکے پیرو اور حواری ہین، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت مین موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہین، ان ہی فقرون سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و

[1] اول سموایل ۷-۶ ویرمیا ۳۶-۶، [2] متی ۴-۲، [3] مرقس ۲-۱۸، [4] قضاۃ ۲۰-۲۶، سموال اول ۷-۶ و ۳۱-۱۳ لوقا ۶-۱۶ وغیرہ،

مستحب روزون کو نہین، بلکہ غم کے مبتدعانہ روزون کو منع فرمایا، انھون نے خود اپنے پیروون کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریون کو فرماتے ہین،

"پھر جب تم روزہ رکھو ریاکارون کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہین، کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ٹھہرین، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر مین تیل لگاؤ، اور منھ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے" (متی ۶-۶-۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہین کہ ہم پلید روحون کو کس طرح نکال سکتے ہین، وہ اس کے جواب مین فرماتے ہین:-

"یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہین نکل سکتی" (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنون مین عاشوراء (یعنی دسوین محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے، کہ اس دن خانۂ کعبہ[۱] پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ مین یہود اپنا عاشوراء الگ مناتے[۲] تھے، یعنی وہی اپنے ساتوین مہینہ کی دسوین تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ — مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۴، [۲] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۵۶۲،

عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ-۲۳) جس طرح تم سے پہلون پر لکھا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت | انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیون اور ناکامیون کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کیجائے تو آخری نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ دنیا مین مختلف ضرورتون کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اسکے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہین، اخلاق جسکا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیجائے، تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیان اور آلودگیان صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہین، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہین فرشتہ ہی،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتون اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل مین آرزوٗن کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤن کی ایک بھیڑ ہے، اور خود ساختہ ضرورتون کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑون، عالیشان عمارتون، لذیذ غذاؤن اور تیز رفتار سواریون کے بغیر ہم جی نہین سکتے؟ فرزند و عیال، زر و مال، اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہون تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا؟ بادشاہون نے فقیرون کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہین، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہوگئے اور نہایت پرمسرت روحانی زندگی بسر کی،

خود ساختہ ضرورتون کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتون کا وسیع دائرہ

ایک دو نقطوں مین محدود ہو کر رہجائے، اور وہ مایۂ قُوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہین رہ سکتا، روح اور جان کا جسم مین باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے، اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقمون اور پانی کے چند گھونٹون پر موقوف ہی، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتون کا مولد و منشا ان ہی چند لقمون اور چند گھونٹون مین افراط، وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندون مین اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کیجائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق و امتیازات کو محیط ہوگی، انسان کے تمام جرائم اور گناہون کی فہرست اگر تیار کیجائے، اور اس کی حرص و ہوس اور قتل خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائین تو ان ہی دو چیزون کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی،

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب مین مادیات کی کثافتون سے بری اور پاک ہونے کیلئے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتون کا دائرہ کم کردے اور آخر یہ کہ قُوت وغذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانون کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہین، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتہً عالمِ ناسوت مین عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے، اس مدت کے اندر انسانون کو اپنے تمام انسانی

ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے، مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات مین داخل ہو جانا چاہئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرضِ زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآنِ مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب مین مشترک تھی اس بنا پر قرآنِ مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت مین شریک کر لیا ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح
كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	تم سے پہلی امتون پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ-۲۳)	حاصل کرو،

روزہ کی غرض و غایت "تقویٰ" ہے، یعنی اپنی خواہشون کو قابو مین رکھنا، اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآنِ پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتون کو بھی واضح کرتا ہے،

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ	تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، (بقرہ-۲۳)	تم اس کی بڑائی کرو، اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضانِ مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا،

رمضان کی ماہیت یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے

عالمِ روحانی مین بھی اسی قسم کا ایک اور نظامِ قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے، اسی یقین کے ساتھ طبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح مین کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا مین کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات مین ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیون کر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام وخاسر اور اہلِ ایمان فلاح یاب وکامیاب ہوتے ہین، ان مین سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور مین آتی ہے، قرآنِ مجید مین تیرہ مقام پر "سنۃ اللہ" کا لفظ آیا ہے، لیکن ان مین زیادہ تر اسی روحانی نظام وترتیب کی طرف اشارہ ہے،

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچکر ایک عام تاریخی قانون بنالیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح انبیاء علیہم السّلام کے سوانح اور تاریخین بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائصِ نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہین،

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصول وقوانین مین سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچکر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالمِ انسانی سے الگ ہوکر، ملکوتی خصائص مین جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ مین وحیِ الٰہی کا سرچشمہ موجین مارنے لگتا ہے، کوہِ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب

توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے[1] کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ)
اس سے پہلے کہ اس کے منھ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا،[2]
اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلعم) نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ
حرا، نام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عباد توں میں مصروف رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثنا میں
ناموسِ اکبر "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" کا مژدہ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے،[3]

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ	رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن
فِیْهِ الْقُرْاٰنُ، (بقرہ ۷-۲۳)	اترا،

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ،	ہم نے قرآن کو ایک برکت والی
(دخان-۱)	رات میں اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، (القدر-۱) ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا،

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے
پہلی بار دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری

[1] خروج ۲۴-۱۸ [2] متی ۴-۲ [3] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان
باب بدء نزول وحی میں اور سیرت ابن ہشام بدء بعثت میں ہے،

کے لئے دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط ان دنون ایک غار کے کونے مین یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا مصروف تھا، اس بنا پر اس ماہِ مقدس مین بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ مین یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات مین (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی کے لئے ضروری تھا کہ

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ	اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی
یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ، (آل عمران ۴)	کرو، خدا تمہین پیار کریگا،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام مین کیا ہے؟ اور رمضانِ مبارک مین روزون کی تخصیص اسلام مین کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس مین بقدر امکان ان ہی حالات و جذبات مین متکیف ہونا چاہئے، جس مین وہ حاملِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی مین ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہین یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گذاری اور خدا کی بڑائی ہے،

فرضیتِ صیام کا مناسب موقع سنہ ۲ھ اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا، اور ان سے صرف

لہ روایات سے اگرچہ بتصریح یہ نہین معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا مین روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا مین روزے بھی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے، کہ آپ ان دنون مین تحنث اور اعتکاف کرتے تھے، جس کا ایک جزء روزہ ہے، آجکل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنون روزہ سے رہتے تھے، (دیکھو خضری مصری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۶ و صفحہ ۴۳)

جسم کی ریاضت مقصود ہوتی، تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرفِ عام مین فاقہ کشی کا نام ہے، اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہوجایا کرتی تھی، ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانون کو جن پریشانیون مین مبتلا کر دیا تھا، اس نے اُن کو عرب کے معمولی طریقۂ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگون نے آنحضرت صلعم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے، اس حالت مین صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانون کی موجودہ زندگی کیلئے موزون ہوسکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس مین کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے، جب امراضِ روحانیہ پیدا ہوجاتے ہین، یا اُن کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور زخارفِ دنیا کی شیفتگی، اور لذاتِ حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہوسکتے تھے، مکہ مین یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا اس لئے وہان اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہین آئی، آنحضرت صلعم مدینہ مین تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانون کو وجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس مین روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت مین، مسلمانون کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا، جس مین مرض کے پیدا ہونے سے

پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ تھا، جو ۲ھ مین فرض ہوا[1]، اس سے یہ شبہہ دور ہوجاتا ہے جو بعض ناواقفون کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغازِ اسلام مین مسلمانون کو اکثر فاقون سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کے روسے فاقہ مستون کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیرون کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد مین لکھا ہے، کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے روزہ وسطِ اسلام مین فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز، اور احکامِ قرآنی کے خوگر ہوچکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لئے موزون تھا،

ایامِ روزہ کی تحدید

روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا مین صرف کردیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانون کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہوجاتا، اور اُن کی شگفتگیِ مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس مین دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے ۱۲ مہینون مین سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کرکے اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ کرین، اور اس کیلئے وہی زمانہ موزون تھا جس مین خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ آنحضرت صلعم اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ مین گذارا، اور آجتک

---

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ، زرقانی بر مواہب جلد اول ص۲۴۸ مصر، و زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص۱۶۰ مصر،

کل اُمتِ محمدیہ پوری دنیا مین اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآنِ پاک مین ماہ رمضان کے روزون کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ، (بقرہ-۲۳) — اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا،

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہین کیا گیا، بلکہ

کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ-۲۳) — جیسا کہ تم سے پہلی قومون پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہین بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، (بقرہ-۲۳) — چند گنے ہوئے دن،

مدت کی تعیین اب بھی نہین، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانۂ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا کہ حسب سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ جائے، اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزون کی آسانیون کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے،

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، (بقرہ-۲۳) — تو جو تم مین بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے چند دنون کی گنتی،

مگر اسی طرزِ ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ مین فرض ہونگے، کہ گم

خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو" نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے، کہ جو دن ہونگے وہ گنے ہوے مقررہ ہونگے، ورنہ مَعۡدُوۡدَاتٍ، (گنے ہوئے) اور عِدَّۃٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ، (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی،

وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ	اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک
فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ، (بقرہ-۲۳)	مسکین کا کھانا فدیہ دے،

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے،

فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ	تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے
وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ	تو یہ بہتر ہے، اس کے لئے، اور روزہ
كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ، (بقرہ-۲۳)	رکھنا تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو،

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا، اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی،

اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوے دنوں کی تعیین کیجاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے، اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَاتٍ، چند گنے ہوے دن، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں ہی، بہرحال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت

لہ عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں

اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا،

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ — وہ رمضان کا مہینہ جس مین قرآن اتارا
فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ — گیا، اس قرآن مین لوگون کے لئے
وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَ — ہدایت ہے، اور ہدایت اور حق وباطل
الْفُرْقَانِ، (بقرہ ۔ ۲۳) — کی تمیز کی دلیلین ہین،

اب وہ مناسب موقع آیا جس مین یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنون کے روزے اسی رمضان مین جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کئے گئے، ارشاد ہوا،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ — توجو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ
فَلْیَصُمْهُ، (بقرہ ۔ ۲۳) — بھر روزہ رکھے،

اب پورے ماہِ رمضان کے روزون کی تعیین وتحدید اور اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ کی تشریح ہوگئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرفِ زمان[1] ترکیبِ نحوی مین اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہی وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۶) ہوتا تو اس کو چاہئے کہ ایامُ العرب کو جو تعداد مین سینکڑون ہین، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیون مین محدود کر دے، اسی طرح قرآن مین اللہ تعالیٰ نے جہان دنیا کے اور ہزارہا انقلابات کو ایامُ اللہ کہا ہے (ابراہیم ۔ ۱) ان کو نو تک کے انقلابات عالم مین محدود کر دے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینون مین طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتین فرمایا، سِیْرُوْا فِیْهَا لَیَالِیَ وَاَیَّامًا اٰمِنِیْنَ، (سبا) اور فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ (گذرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر، اور تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسون اور صدیون پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکین، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ بھی کلی نہین، بلکہ عمومی، ان الفاظ کے لئے ہی جنکی جمع قلت وکثرت دونون مستعمل ہین ایام کا لفظ ان مین نہین اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہی، اور وہ ایوام ہی، جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہی، سند کے لئے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم بحث جمع مکسر، اور لسان العرب لفظ یوم، [1] تفصیل کیلئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ وظرف زمان ص ۱۷۲، مطبع نول کشور ۱۲۶۸ھ،

فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہین گے
صَامَ شَهْرًا اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ مہینہ مین چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا
سمجھا جائے گا، اور اگر یون کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی مین یون کہین گے
صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیتِ پاک مین پورے رمضان
بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لئے مہینہ کے شروع سے
ان روزون کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب مین رواج تھا، اسکے
مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہین، جیسی روایت ہو، وہی ماہِ صیام پر بھی صادق آئیگا،
جیساکہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت تمام صحابہ کرام، خلفاے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل
اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیثِ صحیحہ مین اس کی پوری تصریحات مذکور ہین،

ایک نکتہ قرآنِ پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ مین دیا ہے،

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ - ۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پا دے، وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے،

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی، کسی مقام یا زمانہ مین موجود اور حاضر رہنے کے ہین، اسی سے شہادت
اور شاہد کے الفاظ نکلے ہین، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہین، جو اس ماہِ صیام
مین موجود اور حاضر ہو، اس ماہِ صیام مین غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتین ہین، ایک یہ کہ
ماہِ صیام آئے وہ شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا مین موجود نہ ہو، جس مین وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری
صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہان گذر نہ ہو، یہ صورت اُن قطعاتِ ارضی

مین پیش آئے گی، جہان شب و روز کا وہ نظام موجود نہین جو باقی متمدن دنیا مین ہے، مثلاً جن
مقامات مین کئی مہینون کے دن اور کئی مہینون کی راتین ہوتی ہین، کہ وہان رمضان کی آمد کا
سوال ہی نہین، ہان اگر وہان کے مسلمان چاہین، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار
مان کر روزے رکھین، اور کھولین، (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح مین ہے ثابت ہی)

اسی طرح وہ ملک جہان بیس بیس گھنٹون کے دن ہون تو جو لوگ وہان روزہ کا تحمل نہ کر سکتے
ہون وہ آیت

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ	اور جو بمشکل روزہ رکھ سکین، ان پر
طَعَامُ مِسْكِينٍ، (بقرہ - ۲۳)	ایک مسکین کا کھانا ہے،

پر عمل کر سکتے ہین،

لفظ اطاقۃ کے معنی مین بعض صاحبون کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ اس کے معنی صرف توانائی
وسعت اور قدرت کے ہین، بمشکل قدرت اور طاقت رکھنے کے نہین ہین، مگر یہ صحیح نہین؛
اطاقۃ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے اس کا ثلاثی مصدر کم استعمال مین آتا ہے، اور
طاقۃ کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ مین یہ لکھے ہین،

والطوق الطاقۃ ای اقصیٰ	طوق کے معنی طاقت کے ہین،
غایتہ، وھو اسم لمقدار	یعنی قوت کی انتہائی غایت، اور
ما یمکن ان یفعلہ بمشقۃ	وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی
منہ،	مشقت کے ساتھ کر سکے،

حضرت ابن عباسؓ غالباً یہی معنی قرار دے کر، حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور بڈھے کو فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے[1]،

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی، جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف کو اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گو لغزشگاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) میں ہے،

"اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے"،

توراۃ کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے،

"اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو"،

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے

[1] ابو داؤد کتاب الصوم باب من قال ہی مثبتۃ للشیخ والحبلی،

صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک مین مسلمانون کو جہان روزہ کا حکم دیا ہے وہان یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہین،

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا	خدا تمھارے ساتھ نرمی چاہتا ہے، سختی
يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ-۲۳)	نہین چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا	خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ
وُسْعَهَا، (بقرہ-۴۰)	تکلیف نہین دیتا،

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ مین کی ہے،

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ	وہ ان کو نیکیون کا حکم دیتا ہے، برائیون
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ	سے روکتا ہے، اور گندہ چیزون کو
الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ (اعراف-۱۹)	حرام کرتا ہے، اور اس طوق اور زنجیرون
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ	کو جو ان کے اوپر پڑی ہین، ان سے
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ	اتارتا ہے،

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام مین کوئی چیز بھی اس غرض سے نہین رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ مین داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی اُن سختیون کو جو لوگون نے بڑھا رکھی تھین، بتدریج کم کر دیا،

روزہ مین اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیون کو جس حد تک کم کیا اور اس مین جو سہولتین پیدا

کین وہ حسب ذیل ہین،

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان مین اکثر روزہ صرف پیروون کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوٴن مین غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہین، پارسیون کے یہان صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیون مین صرف عورتون کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کیلئے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام مین پیشوا، غیر پیشوا، عورت مرد کی کوئی تخصیص نہین، اس نے تمام پیروون کو عام حکم دیا اور اس مین کسی چیز کی کوئی تخصیص نہین کی،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	اس مہینہ مین جو موجود ہو وہ مہینہ بھر
فَلْيَصُمْهُ. (بقرہ - ۲۳)	روزہ رکھے،

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب مین عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال مین روزہ کی جو تاریخین جن موسمون مین متعین ہونگی، ان مین تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم مین چھوٹے یا بڑے دنون مین واقع ہوتے ہین، یا تو وہ مختلف ملکون مین ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہین، اسلام کے روزون کی تاریخین قمری مہینون سے ہین، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنون کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہین، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک مین ہر موسم مین آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہی،

۳۔ جہانتک دیگر مذاہب کی الہامی کتابون کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید

اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثنار نظر سے نہین گذری، توراۃ مین تو یقیناً مذکور نہین، بلکہ یہانتک ہو کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہین مگر یہودیون کے پاس آکر رہا ہو[1]، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگون کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہین، عورتین ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام مین روزہ سے مستثنیٰ ہین، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہین، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہین مستثنیٰ ہین، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنون کی قضا بعد کو رکھین، اور جو دائمی طور سے معذور ہین، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دین،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا	اگر تم مین کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ
أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ	رمضان کے بعد اور دنون مین روزے
أُخَرَ، وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ	رکھ لے، اور وہ لوگ جو مشکل روزے
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ،	رکھ سکتے ہون اُن پر ایک مسکین کا
(بقرہ ۲۳-۲۳)	کھانا ہے،

ترمذی مین ہے،

عن انس قال النبی صلی اللّٰہ	حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا
علیہ وسلم ان اللّٰہ وضع	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے

[1] احبار ۱۶، ۲۹،

عن الحامل والمرضع الصوم ۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا،

۴۔ اور مذہبوں مین روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا،
یا روزہ کے دنون مین غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے
اس مین بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات مین گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا،
مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹون کی رکھی،

۵۔ جینیون کے یہان، ایک ایک روزہ ہفتون کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی
روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیون کے ہان پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف
صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (بقرہ-۲۳) پھر روزہ کو رات تک ختم کرو،

۶۔ یہودیون کے ہان یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، کھا لیتے، پھر
نہین کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب مین یہ رواج تھا کہ سونے
سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتداءً اسلام مین بھی یہی قاعدہ
تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر مین شام کا کھانا نہین تیار ہوا تھا، ان کی
بیوی کھانا پکا رہی تھین، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو اُن کی بیوی کھانا لیکر آئین
وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہین کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش
آگیا، اس پر یہ آیت اُتری،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو

لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ	جب تک رات کا تاریک خط صبح
الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، (بقرہ-۲۳)	کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے،

۷- شروع اسلام مین دستور تھا، کہ روزہ کے دنون مین راتون کو بھی میان بیوی علحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس مین مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دیدی،

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ	روزہ کی شب مین بیویون سے مقاربت
الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ	تمہارے لئے حلال کی گئی، وہ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ	تمہاری پوشاک ہین اور تم اُن کی
لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ	خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے
كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	خیانت کرتے تھے، تو اُس نے
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ	معاف کیا، اب بیویون سے ملو جلو
فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ	اور خدا نے تمہارے مقدر مین جو کچھ
ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ، (بقرہ-۲۳)	رکھا ہے، (یعنی اولاد) اسکی تلاش کرو،

۸- بھول چوک اور خطاؤ نسیان اسلام مین معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے، یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہین ٹوٹتا،

عن ابی ھریرۃ من اکل او	ابو ہریرہ سے مروی ہے، جو بھول کر
شرب ناسیا فلا یفطر فانما	کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہین ٹوٹتا
ھو رزق اللہ، (ترمذی)	کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی،

۹- اسی طرح اُن افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہین لیکن وہ قصداً سرزد نہین ہوئے بلکہ بلاارادہ از خود سرزد ہوئے ہین، روزہ نہین ٹوٹتا،

قال النبی صلعم الا لا یفطر	پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے ہو گئی
من قاء ولا من احتلم،	یا سوتے ہین غسل کی ضرورت پیش آگئی
(ابوداؤد)	اس کا روزہ نہین ٹوٹتا،

۱۰- یہودیون ہین اکثر روزے، چونکہ مصائب کی یادگار، اور غم کی علامت تھے، اس لئے روزہ کی حالت مین وہ زیب وزینت نہین کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰ نے فرمایا:

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکارون کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہین، کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہون، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منھ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے" (متی ۶-۱۶)

لہ قے ہونے کی فقہ حنفی مین کئی صورتین ہین، ان مین سے بعض مین روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض مین نہین،

اسلام مین بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت مین سر مین تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا، اسلام مین روزہ کے منافی نہین، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کرکے ریا مین گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے مین اور خدا کے اس حکم کے بجالانے مین نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو،

۱۱- روزہ دوسری عبادتون کے مقابلہ مین ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افرادِ اُمت کو اس مین غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت صلعم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینون مین کچھ دن مقرر تھے، ہفتون مین بھی کچھ دن مقرر تھے، اُن کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزون کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا،

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی،	تم مین مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے، (یعنی روحانی غذا)

لوگون نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گذر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا، تو مین اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا،[۱]

[۱] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶۳،

روزہ کے مقاصد اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام مین روزہ کے کیا مقاصد ہین، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہوچکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہین؛

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہین ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتون اور مصلحتون پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتون کے چہارگانہ ستونون پر قائم ہے، اور ان مصلحتون اور منفعتون کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کردیا ہے، اور بتادیا ہے، چنانچہ روزے کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا، تین مختصر فقرون مین بیان کردیئے ہین؛

۱- لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ-۲۳)	۱- تاکہ خدانے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو،
۲- وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (بقرہ-۲۳) (بقرہ-۲۳)	۲ اور تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو،
۳- لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ-۲۳)	۳- تاکہ تم پرہیزگار بنو، (یا تم مین تقوی پیدا ہو۔)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبرون کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا بامکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتون سے وہ پاک رہے، اور انھون نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہان تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے، اور پیغام ربانی

نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، تب توراۃ کی لوحین اُن کو سپرد ہوئین، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے ابلا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حراء مین ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروفِ عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا،

حاملِ قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی مین ۴۰ دنون کا روزہ مناسب اور صرف چالیسوین دن کا روزہ فرض سمجھتے ہین، عیسائیون کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی مین یہی چاہئے تھا، مگر انھون نے پال کی پیروی مین جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہین کی اس کی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانون کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی مین یہ چند دن اسی طرح گذارین، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگون
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	پر (ان کے رسولون کی پیروی اور
مِن قَبْلِكُمْ،	ہدایت ملنے کے شکریہ مین) روزہ فرض
(بقرہ ۔ ۲۳)	کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا،

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتون نے اپنے اپنے پیغمبرون کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز مین بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلعم کی لاکھون اور کرورون امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور

اپنے رسول کی پیروی مین وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشون سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے،

شکریہ کے | یہ روزہ انبیاء علیہم السّلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہین ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانون پر کیا، شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتابِ الٰہی وہ تعلیمِ ربانی، وہ ہدایتِ روحانی جو ان ایام مین انسانون کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوجِ کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور اُن کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتون کے پانسے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانون سے ان کے کاشانون کو معمور کر دیا، جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا، قرآنِ پاک اپنے ان الفاظ مین اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ،	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی، اور تاکہ تم اسکا شکریہ (ادا کرو)
(بقرہ ۲۳-۲)	

اس ہدایتِ ربانی اور کتابِ الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتون مین مسلمان اس پوری کتاب کو نمازون (تراویح) مین پڑھتے اور سنتے ہین، اور اس

مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں مین جاتے، اور خوشی و مسرت کے ولولون کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہین،

تقویٰ | روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ	اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح
الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ	روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ،	پہلے لوگون پر فرض کیا گیا، تاکہ تم تقویٰ
(بقرہ ۵-۲۳)	حاصل کرو،

اس "تقویٰ" دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہون سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتون کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے، اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانون کے دلون مین گناہون کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہین، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن نوجوانون کا علاج جو اپنی مالی مجبوریون کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہین رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہین رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے، کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے[۱]،

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الصوم،

۲- اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ روزہ کی مشروعیت مین ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس مین اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینون مین ایک مہینہ تک مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات مین ایک وقت کھانا کھائے، اور ہوسکے تو ۲ وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیون کو کھلادے' ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہین، تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع مین روزہ کا بدل غریبون کو کھانا کھلانا، قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبون کو کھانا کھلانا، یہ دونون باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہین، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور، یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہین، اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہین ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے،

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ-۲۳)	اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہون، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دین،

حج مین اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے،

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ، (بقرہ-۲۴)	تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے،

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام مین ادا کرین، جسکو تمتع کہتے ہین، ان پر قربانی واجب ہے، جو غریبون ہی مین تقسیم کیجاتی ہے، اگر یہ نہ ہوسکے تو

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، (بقرہ-۲۴)	تو تین روزے رکھین، تین حج مین اور سات گھر آکر،

حج مین جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لیجا کر ذبح کیا جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ — یا چند مسکینون کا کھانا یا اسی کے

عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (مائدہ-۱۳) — برابر روزے،

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے، تو اس پر دس مسکینون کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (مائدہ-۱۲) — تو تین دن کے روزے،

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے، اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت مین نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (مجادلہ-۱) — تو دو مہینے متواتر روزہ،

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ-۱) — تو ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلانا،

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ وخیرات، غریبون کے کھلانے، بلکہ غلامون کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۳- روزہ ہی امیرون اور پیٹ بھرون کو بتاتا ہے کہ فاقہ مین کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیون

کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہی، جو خود بھوکا نہ ہوا اُس کو بھوک کی، اور جو خود پیاسا نہ ہوا اُس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کا حال یہ تھا، کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت "باد رواں" کی طرح ہوتی[1] تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے یہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور اُن کو شکم سیر کیا جاتا ہی،

۴۔ انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش، جد و جہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے،

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی،

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہین زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریون کا نشانہ بنا دیتا ہی طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہین، کہ اکثر حالتون مین انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریون کا یہ قطعی علاج ہے، طبی ہدایت ہی کہ کم از کم ہفتہ مین ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام مین ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہین، مگر اسی کے ساتھ سال مین ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہی جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہین، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریون کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انھون نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور مین بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہی،

۶- انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتون پر غور کرے، تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام مین صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت مین صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہین تو کم از کم سال مین ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے،

۷- انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہی جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخرۂ معدی کی مصیبت سے

پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہِ صادق ہے،

۸- روزہ بہت سے گناہون سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہون کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہان روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہون اور غلطیون کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ مین تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے[1]، اور اسلام مین بھی بہت سے موقعون مین یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینون کو کھانا کھلائے، اگر اس کی سکت نہ ہو،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ	تو تین دنون کے روزے یہ تمھاری
كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ	قسمون کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو
وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ط (مائدہ-۱۲)	اور اپنی قسمون کا لحاظ رکھو،

اسی طرح حج کی حالت مین شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینون کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا	یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ	گناہ کی سزا چکھے، اللہ نے معاف کیا
عَمَّا سَلَفَ، (مائدہ-۱۳)	جو ہو چکا،

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خونبہا

[1] احبار ۱۶ - ۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳ - ۲۷،

یعنی ایک مسلمان غلام آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ، (نساء - ۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کیلئے دو مہینے کے لگاتار روزے،

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے،

۹- اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے محنت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے، اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمامتر عبادتوں اور نیکیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدابہار تھی لیکن رمضان

کے موسم مین وہ تیز ہواؤن سے بھی زیادہ ہوجاتی تھی[۱]؛

۱۰۔ ان ہی باتون کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہین ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض وغایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض وغایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ ہی نہین رکھا گیا، یا یون کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہوگیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے، کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین ہے، کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[۲]"؛ ایک اور حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا "روزہ برائیون سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتین نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہانتک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ مین روزہ سے ہون[۳]"؛ بعض حدیثون مین ہے کہ آپنے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس مین سوراخ نہ کردو[۴]" صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ اس مین سوراخ کس چیز سے ہوجاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے[۵]"، چنانچہ بعض علماء کی رائے مین جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح

۱۔ صحیح بخاری باب الوحی جلد اول صفحہ ۳، ۲۔ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵ و ترمذی باب الصوم ص ۱۴۴ و ابوداؤد صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲، ۳۔ صحیح بخاری صوم جلد ۱ ص ۲۵۲، صحیح مسلم صوم جلد ۱ ص ۴۷۷ مصر و موطا امام مالک صوم ص ۹۷، نسائی ۲۵۵، ۴۔ سنن دارمی صفحہ ۲۱۸، مجمع الفوائد بحوالہ نسائی ص ۱۵۲ میرٹھ، ۵۔ مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط ص ۱۵۲ میرٹھ،

گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[1]،

۱۱- تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اسکا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے،

۱۲- اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے

الصوم لی وانا اجزی بہٖ[2] — روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دونگا،

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں ہے،

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ، (زمر - ۲) — صبر کرنے والوں کو انکی مزدوری بے حساب پوری کیجائے گی،

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی صابرین کی جماعت میں داخل ہو کر اجرِ بے حساب کے مستحق ہوں گے،

۱۳- روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی

---

[1] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۰، [2] صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم،

مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ - ۵) — اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو،

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لئے اس آیتِ بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں،[1]

۱۴۱- یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمالِ حسنہ میں ہے، جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی، اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

...... وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ	...... اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ	اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے
وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ	اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور خدا کو
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا	زیادہ یاد کرنے والے اور یاد کرنے والی عورتیں،
عَظِيْمًا، (احزاب - ۵)	انکے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری،

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ۱ ص ۱۹۹ مصر،

حج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ۝ (آل عمران - ۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے، اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہین، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام مین یہ ملک عرب کے شہر مکہ مین جا کر وہان کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات مین حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجا لانے کا نام ہے،

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والون کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل، خاندان اور خانوادہ کی صورت مین تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیمون اور جھونپڑون کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت مین منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا، اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی،

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت

ابراہیم خلیل کے عہد مین ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسمٰعیل کے زمانہ مین وہ چند خیمون اور جھونپڑیون کی مختصر سی آبادی کی صورت مین ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد مین یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصور احاطہ مین دو خاص با عظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اُس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ مین ہوتی تھی، اور اسی محافظ یا دیوتا یا ستارہ کی وہان پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمین اور پیداوارین اس مین جمع ہوتی تھین، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہان کلدانیون کی آبادی اور حکومت تھی یہان بھی بدستور ستارون کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا مین سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگون نے ان کو اس کے لئے تکلیفین دین، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جن مین سام کی اولاد پھیلی ہوئی

[1] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخون اور آثارِ قدیمہ مین اس بیان کے شواہد ملین گے، اور میری تصنیف ارض القرآن مین ان کے اقتباسات مذکور ہین،

تھی، اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں[1]،

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا، اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت مقرر کی، یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی، جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن، اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا،

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے یہ گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں علیحدہ رہ کر لوگوں کو

---

[1] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے،

مین دینِ حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا دستور یہ تھا کہ جہان کہین ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہان خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ تورات کتاب پیدائش مین اُن کی تین قربان گاہون یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہین،

"تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک مین تیری نسل کو دونگا، اور اُس نے وہان خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہان سے روانہ ہو کے اسنے "بیت ایل" (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہان سے اس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا" (۱۲-۷-۸)

اس کے بعد ہے،

"اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل مین اس مقام تک پہنچا۔۔۔۔ جہان اس نے شروع مین ایک قربان گاہ بنائی اور وہان سے ابراہیم نے خدا کا نام لیا" (۱۳-۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہان ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

"اٹھ اور اس ملک کے طول وعرض مین پھر، کہ مین اُسے تجھ کو دون گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا، اور ممرے کے بلوطون مین جو حبرون مین ہین جا رہا، اور ایک قربان گاہ بنائی، (۱۳-۱۷-۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہین، اور خدا کے گھر حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی، جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال مین ہے، کہ جہان ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

"اور اس نے وہان مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہان اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہان اسحاقؑ کے نوکرون نے کنوان کھودا" (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہان مقدس رویا ہوئی، وہان،

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا، اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو مین نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب مین سے جو تو مجھے دیگا، دسوان حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دونگا" (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کرے گا، اور تو میری قربانگاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو" (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب،

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقون کے لئے بارہ

ستون بنائے ...... اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنون مین رکھا، اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا: (خروج ۲۴-۴-۶)

اوپر کے اقتباسات مین اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور انکی نسل مین اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ مین کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا مین خدا کا پہلا گھر ہے،

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، اور یہ بحث بھی وہین گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ مین یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ، جانورون پر ہاتھ رکھدیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنون مین سر نہین منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہوجاتے تھے تب اُن کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کیجاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی،

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے

توراۃ اور قرآنِ پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالامال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے"

(۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

"خداوند فرماتا ہے، اس لئے کہ تونے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دونگا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے مانند بڑھاؤنگا، اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوجائیگی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تونے میری بات مانی۔"

قرآنِ پاک میں ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ	اور جب ابراہیمؑ کے پروردگار نے چند
بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ	باتوں میں اس کی آزمائش کی پھر اس نے
جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ	ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا،
(بقرہ ۲ - ۱۵)	کہ میں تجھ کو لوگوں کے لئے پیشوا بنانے
وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا	اور ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں چنا اور وہ
وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ	آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے،

والا ہوں،

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ	جب اُس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ،	کو سپرد کردے، اس نے کہا مین نے
(بقرہ ۔ ۱۶)	اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا
یٰۤاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ	اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ
الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی	کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والون
الْمُحْسِنِیْنَ ، (صفت ۔ ۳)	کو بدلہ دیتے ہین،

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن مین پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہین،

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ	خدایا تو محمدؐ اور محمدؐ کی (جسمانی وروحانی)
عَلٰۤی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی	نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے
اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰۤی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ	ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی (جسمانی وروحانی)
	نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ مین تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کردینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم ورضا اور صبر وشکر کا وہ امتحان تھا، جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی "پیشوائی" اور آخرت کی "نیکی" نہین مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کردینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشون، تمناؤن اور آرزوؤن کی قربانی تھی، اور خدا کے حکم

کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا،

اسلام قربانی ہی اسلام کے لفظی معنی "اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا" ہی، اور یہی وہ حقیقت ہی جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہی کہ ان باپ بیٹون کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی مین اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا،

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ،

(صٰفّٰت - ۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا،

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ، وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(بقرہ - ۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا مین مقبول کیا، اور وہ آخرت مین بھی نیکون مین سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کریا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے

اسلم: سپرد کر دو اور گردن جھکا دو، فرمانبرداری کی راہ اختیار کرو (بیضاوی)

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ
مین سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی
ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بار امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے
دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل مین اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ مین موجود رہین اور
بالآخر اُن کی نسل مین وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا پر وقف عام کردے،
چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً	اپنا فرمانبردار) بنا اور ہماری نسل مین
لَّكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا	سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار)
وَتُبْ عَلَيْنَا ج إِنَّكَ أَنتَ	جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، رَبَّنَا	کے دستور) بتا، اور ہم کو معاف کر،
وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	بے شک تو معاف کرنے والا اور
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ	رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	اس مین اپنا ایک رسول بھیج جو تیری
وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ	آیتین اُن کو پڑھ کر سنائے، اور ان کو
الْحَكِيمُ،	کتاب، اور حکمت سکھائے، اور اُن کو
(بقرہ - ۱۵)	پاک وصاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے

یہ رسول محمد رسول اللہ صلعم تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینۂ محمدی کا خزانۂ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے،

یہ قربانی کہاں ہوئی

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ مین اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجمون نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجمون نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانون کے مقابلہ سے ۱۸۹۰ء مین اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع مین چھپا ہے، اس مین اس مقام کا نام "مُریَا" لکھا ہے، اور اس کے فارسی ترجمہ مین جو انہی زبانون کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۹۵ء مین لندن مین چھپا ہے اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور درحقیقت یہ لفظ مَروہ ہے، جو مکہ مین بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے،

"خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خود را کہ یگانۂ تست و او را دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برو، و او را در آن جا بر یکے از کوہ ہائیکہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران، بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیاراست و دو نفر از نوکران خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آن مکانیکہ خدا او را فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند

کردہ آن مکان را از دور دید، آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما این جا بمانید، تا من با پسر بدانجا رویم، وعبادت (دوسرے ترجمون مین سجدہ ہی) کردہ نزد شما باز آئیم۔ (پیدائش ۲۲) اس عبارت مین اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلون سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے، اور ہماری جماعت مین سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے اس لئے یہان بحث بے محل ہے، بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہان وہ قیام پذیر تھے چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتون کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربان گاہ، و بیت اللہ ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہان حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا، اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکرون کو یہ کہا جاسکے کہ "مین وہان جاکر عبادت کرکے واپس آتا ہون" یہ خصوصیتین کعبہ کے سوا کہین اور نہین پائی جاتین، اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کرسکے اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) مین موجود تھی اور ہے، اور نہ بیت المقدس یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے،

برخلاف اس کے بنو اسمٰعیل یعنی اسمٰعیلی عربون مین اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس مین امتداد زمانہ اور تغیرات

کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیون کے سبب سے اس مین بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، تاہم اصل شئی باقی تھی، عرب مین بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربون کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانۂ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکسان اعتراف تھا، یہانتک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قسمین کھاتے تھے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانۂ کعبہ مین جہان مشرکون کے بتون کی صفین تھین، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسٰیؑ، اور حضرت مریمؑ کی تصویرین بھی تھین[1]،

مکہ اور کعبہ

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفا کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اُس کی رحمتون اور برکتون کا "سمت القدم" ہے، وہ ازل سے اس دنیا مین خدا کا معبد اور خداپرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبرون نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتون کی سمت اس کو قرار دیا کہ

اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ، (آل عمران-۱۰) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگون کیلئے بنایا گیا

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیون مین اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ مین توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا، کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے، دنیا مین توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآنِ پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳-۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ مین بھی اَلْبَیْتِ الْعَتِیْقِ (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر،

[1] اخبار مکہ للازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرۃ ابن ہشام،

اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ، (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چہار طرف سے پہاڑوں سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاھِیْمَ مَکَانَ	اور ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ
الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا	کو ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو
(حج - ۴)	شریک نہ بنا،

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی، اور اس کو ان کی جا پناہ اور ٹھکانا بنا دیا، کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دینِ حق کی تبلیغ کریں، توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا، کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کرکے واپس آتا ہوں، ضروری ہے، کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَھِّرْ بَیْتِیَ (اور میرے

گھر کو عبادت گذارون کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعۂ توراۃ مین حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت مین واقع تھا، اور کبھی اس کا نام "بیابان" تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہین[1]، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا،

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ، (ابراہیم-۶)

خداوندا مین نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی مین لا کر بسایا ہے،

تو حقیقت مین یہ "بن کھیتی کی ترائی اور بے آب و گیاہ میدان" اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی، اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہان حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی،

وَارۡزُقۡ اَھۡلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، (بقرہ-۱۵)

اور خداوندا یہان کے رہنے والون کو پھلون کی روزی پہنچا،

"مکہ" قدیم زبانون کے بعض محققون کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی "گھر" کے ہین[2]، اس سے دو حقیقتین ظاہر ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور

---

[1] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد مین ہے، از ص۶۵ تا ص۶۰ طبع اول،
[2] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴، مصر،

لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود مین آئی اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہلِ عرب کی روایات کی صحت پر دلیلِ قاطع ہی؛

مکہ کا بکہ نام حضرت داوٗدؑ کی زبور مین سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ مین اس کا حوالہ گذر چکا ہی، یہان یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان مین "بکٗ" کے معنی آبادی یا شہر کے ہین، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہی، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہی، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآنِ پاک مین آیا ہی،

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا گھر جو لوگون کی عبادت کے لئے
لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ، (آل عمران۔ ۱۰)	بنایا گیا وہ وہی ہی جو بکہ مین ہی،

کعبہ کے لغوی معنی "چوکھونٹے" کے ہین، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہی، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

یونانی تاریخون مین بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر مین کہتا ہے،

"ثمودیون اور سباوالون کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہین[1]"

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود مین تھا، اور سبا کا یمن مین، ظاہر ہے کہ ان دونون

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰،

ملکون کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہان کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہون خانۂ کعبہ ہے، رومیون کی تاریخ مین بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء مین رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسرون کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس مین شام کے دو افسرون نے اٹھ کر کہا کہ وہ آیندہ لڑائی مین شریک نہین ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا،

"تمہارا یہ خطرہ صحیح نہین ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس مین عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہین، اور اس زمانہ مین ہر قسم کے ہتھیارون سے وہ پرہیز کرتے ہین"[1]

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے،

ان تمام شہادتون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ عرب یا بنی اسمٰعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کیساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار مین حج اور ارکانِ حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے[2]، یہان تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازارون اور میلون کی روایات کے قائم رکھنے مین بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا[3]، اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۵۸ء، [2] مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن مین اس قسم کے اشعار جمع کر دیئے ہین، [3] کتاب الامکنہ والازمنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰،

کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں مین یہانتک کہ یمن و بحرین تک مین پہنچنے مین کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم مین عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی مین اس موسمی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار ہی | حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اُس پر لبیک کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام مین آئے تھے، اور عین اُس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ مین قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سنکر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی،

اَنْ یّٰاِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ	یہ کہ اے ابراہیمؑ، تو نے اپنا خواب سچ
الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی	کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکوکارون کو بدلہ
الْمُحْسِنِیْنَ ...... وَفَدَیْنٰہُ	دیتے ہین، ...... اور ایک بڑی
بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صفٰت۔۳)	قربانی دے کر ہم نے اسکے بیٹے کو چھڑا لیا

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی مین خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے،

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَ	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگون
اَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ	کا مرجع اور امن بنایا، اور (کہا کہ) ابراہیم
مُصَلًّی وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ	کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ	بناؤ، اور ابراہیم و اسمٰعیل سے عہد لیا کہ
وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَ	تم دونون میرے گھر کو طواف اور
اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ	قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والون
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ	کے لئے پاک کرو، اور یاد کرو جب
مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ	ابراہیمؑ نے کہا کہ میرے پروردگار اسکو
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ	امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والون
وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا	کو کچھ پھلون کی روزی دے، جو ان مین
ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ	سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے،
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ	خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اسکو
اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ	تھوڑا فائدہ پہنچاؤنگا، پھر اس کو دوزخ
اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ	کے عذاب کے حوالہ کرونگا، اور وہ
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ	کتنی بری بازگشت ہے، اور یاد کرو
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ	جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً	بنیادین اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا
مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا	مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب
مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ	(ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما،
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ	بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَمَن يَرْغَبُ
عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا
مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ
فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝
إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ
قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

(بقرہ ع - ۱۵و۱۶)

اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک
تابعدار (مسلم) فرقہ بنا، اور ہم کو اپنے
حج کے ارکان دکھا، اور ہم پر اپنی
رحمت رجوع کر، (ہماری توبہ قبول
کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم
والا ہے، اے ہمارے رب! ان
میں ان ہی میں سے ایک کو رسول
بنا کر بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے
اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم
دے، اور ان کو پاک و صاف بنائے،
بیشک تو غالب اور دانا ہے، اور
ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیریگا
بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان
بنائے، حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم
کو) دنیا میں چنا، اور آخرت میں وہ
نیکو کاروں میں سے ہوگا، یاد کرو جب
اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار
(مسلم) بنجا، اس نے کہا کہ میں پروردگار عالم کا تابعدار (مسلم) ہو گیا

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ
الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا
وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ
الْقَآئِمِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ
وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ
رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ
یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ
لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ
یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ اَیَّامٍ
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ
مِّنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ
ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا
نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ
الْعَتِیْقِ ٥ ذٰلِكَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ
حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ
عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ (حج-۴)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے
اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا، کہ کسی کو
میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے گھر کو
طواف، قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے
والون کے لئے پاک کر، اور لوگون
مین حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے
پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی
ماندی) دُبلی سواریون پر، ہر دور دراز
راستہ سے آئین گے، تاکہ وہ اپنے نفع
کی جگھون پر حاضر ہون، اور ہم نے
ان کو جو چوپائے جانور روزی دیئے
ہین، ان (کی قربانی) پر چند جانے
ہوئے دنون مین خدا کا نام لین، تو
ان مین سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر
کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور
کرین، اور اپنی منتین پوری کرین اور
اس قدیم گھر کا چکر لگائین یہ سُن چکے اور
سو جو کوئی، اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ
مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا
لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ
وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَشْكُرُوْنَ ۞ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ
مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى
عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِي السَّمَآءِ ۞

(ابراهیم-٦)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی اے
میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا
اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتون کی پرستش
سے بچا، میرے پروردگار ان بتون نے
بہتون کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی
کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری
نافرمانی کرے گا، تو تو بخشنے والا مہربان
ہے، اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی
کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی مین
تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے
اے ہمارے پروردگار، یہ اس لئے تاکہ
یہ تیری نماز کھڑی کرین، تو کچھ لوگون کے
دلون کو ایسا بنا کہ وہ اُن کی طرف مائل
ہون، اور ان کو کچھ پھلون کی روزی دے
تاکہ یہ تیرے شکر گذار رہین، اے ہمارے
پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائین اور
جو ظاہر کرین، اور اللہ سے زمین مین اور آ
سمان مین کچھ چھپا نہین

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ	کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ	دین کی پیروی کرو، شرک سے منہ موڑ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ	کر، اور ابراہیم مشرکون مین نہ تھا، بیشک
وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ	وہ پہلا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا
مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ٥	وہی ہے جو بکہ مین ہی، بابرکت اور
فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ	دنیا کے لیے راہ نما، اس مین کچھ کھلی ہوئی
وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۚ وَ	نشانیان ہین، ابراہیم کے کھڑے
لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ	ہونے کی جگہ، اور جو اس مین داخل ہو
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ	وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگون
وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ	پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہی جس کو
الْعٰلَمِيْنَ،	اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو
	اور جو (اس قدرت کے باوجود)
(آل عمران - ۱۰)	اس سے باز رہی تو خدا دنیا والون سی
	بے نیاز ہے،

یہ وہ آیتین ہین جنکا تعلق اس موضوع سے ہے، ان مین نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکون سے ہٹا کر جن مین وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش مین تھے۔

تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائین، یہ تھکا ناعنایت کیا جو ازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہان خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کرین، اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گذارون کا مسکن بنائین؛

یہ مقام ویران اور بیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا یہان تیرے مقدس گھر کے پڑوس مین اپنی کچھ اولاد بساتا ہون، ان کو روزی پہنچانا، اور لوگون کے دلون کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہین، اور ان کو اس لئے یہان بساتا ہون تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قومون کی بت پرستی سے بچے رہین اور تیری خاص عبادت بجالائین، ان مین جو نکوکار ہون وہ میرے ہین، اور جو بدکار اور گمراہ ہون ان کا تو مالک ہی، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا! میری اولاد مین ایک رسول بھیجنا، جو ان کو نیک تعلیم دے،

قرآن کا دعوی ہے کہ اس مقام اور اس گھر مین حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیان ہین، اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ، اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگون کو چاہئے کہ دور دور سے یہان آئین اور اپنے دینی و دنیاوی فائدون کو حاصل کرین، اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کرین، اور یہان اسمٰعیلؑ کی یادگار مین قربانی کرکے غریبون کو کھلائین، اپنی نذر پوری کرین، اور اس حالت مین وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہون، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہون، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہون، اور وہ اس حالت مین ظاہری زیبائش و آرایش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہون، اور چند روز یہان

ابراہیمی یادگارون پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کرکے، ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کرین،

اوپر توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کا دستور تھا، کہ وہ جہان کہین کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے اس ابتدائی عہد مین کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کرکے خدا کا گھر بنا لیتے، وہان قربانی گذرانتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانۂ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے، کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنون تک سر نہین منڈاتا تھا، نذر پوری کرلینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا، پھر جہان یہ مذکور ہے کہ "اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو"[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، اور کمر مین تہ بند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس مین جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب مین "لبیک" کہا اور اردو مین ہے کہ "مین حاضر ہون" کہا یہی صدا لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اسلامی حج مین، اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے، کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربانگاہ کے چارون طرف پھراتے تھے، یا نثار کرتے تھے، حج مین یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام مین "حج" ہے،

حج کی حقیقت

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتون اور برکتون کے موردِ خاص مین حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان

[1] خروج ٢٠ - ٢٦،

قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندون کی پیروی مین اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس بندگی کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزارون برس پہلے بجالائے، اور خدا کی نوازشون اور بخششون سے مالامال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے، جس کو حاجی ان بزرگون کے مقدس اعمال اور قدیم دستورون کے مطابق حج مین اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کرکے ظاہر کرتے ہین تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنون بن سِلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہین، وہ خود اپنے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح خدا کے حضور مین نذر کرنے جاتے ہین، اس لئے اتنے دنون تک سر کے بال نہ منڈاتے ہین، نہ ترشواتے ہین، دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہین، نہ خوشبو لگاتے ہین، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہین، نہ سر چھپاتے ہین، اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السّلام تین دن کے سفر کے گرد و غبار مین اَٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر مین آئے تھے، آتے ہین، اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانون پر ہوتا ہے،

لبیک اللّٰھم لبیک، لبیک	مین حاضر ہون اے اللہ مین حاضر ہون
لا شریک لک لبیک، ان	مین حاضر ہون تیرا کوئی شریک نہین، سب
الحمد والنعمۃ لک والملک	خوبیان اور سب نعمتین تیری ہی ہین اور
لک، (صحیح مسلم حج)	سلطنت تیری ہی ہے تیرا کوئی شریک نہین

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود مین بلند کرتے پھرتے ہین، جہان جہان ان دونون بزرگون کے نقشِ قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہین، اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چارون طرف پھرا کر تصدق کرتے ہین، پھر جہان سے جہانتک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے مروہ پر پہنچکر بیٹے کی قربانی کرینگے، وہان ہم دوڑتے ہین، اور دعا کرتے ہین، اور گناہون کی بخشایش چاہتے ہین، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان مین جمع ہو کر، اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہون اور کوتاہیون کی معافی چاہتے ہین، خدا کے حضور مین گڑگڑاتے ہین، روتے ہین، قصور معاف کراتے ہین، اور آیندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہین اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے[1]، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگون کے نقشِ قدم، اور ان کی دعا کے مقامات، اور تجلیاتِ ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثرون کو عمر مین ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھون بندگان خدا کا، ایک ہی وحدت کے رنگ مین، ایک ہی لباس اور تشکل وصورت، ایک ہی حالت اور جذبہ مین سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑون کے دامن مین اکٹھے ہو کر، دعا، و مغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیون اور بربادیون کا ماتم، اپنی بدکاریون کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہان ابراہیمؑ خلیل اللہ

---

[1] ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج،

سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت مین اور یہین پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے، جسکی لذت تمام عمر فراموش نہین ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل مین جسمانی طور سے ذبح کرتے ہین، اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہین، جو کبھی اسی میدان مین اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل مین دنیا کے سب سے پہلے داعیِ توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیون کے دلون مین موجزن ہوتے ہین اور اُن کی زبانون سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت مین ظاہر ہوتے ہین، (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ	مین نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اسکی
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	طرف منہ کیا جس نے آسمانون کو اور
حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ	زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر اور مین
(انعام-۹)	ان مین نہین جو خدا کا شریک بناتے ہین
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ	میری نماز اور میری قربانی، اور میرا
وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے
لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ	جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝	کوئی شریک نہین، اور یہی حکم مجھ کو ملا

ہے، اور مین سب سے پہلے فرمانبرداری

(انعام - ۲۰) (اسلام) کا اقرار کرتا ہون،

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہین،

حج کی اصلاحات

حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہلِ عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تعلیم دی، اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان مین سرے سے موجود نہ تھی اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلین طے کرنی پڑین، روزہ نے بھی یوم عاشوراء سے لیکر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا اُن مین بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہلِ عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے، تو تمام قبائل منیٰ مین آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہین مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکرِ الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اسپر

یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ	جس طرح اپنے باپ دادون کا ذکر کرتے
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا،	ہو اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند
(بقرہ - ۲۵)	آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو،

۲- قربانی کرتے تھے، تو اس کے خون کو خانۂ کعبہ کی دیوارون پر لگاتے تھے، کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہودیون بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونون باتین مٹادی گئین، اور یہ آیت اتری،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا	خدا کے پاس قربانیون کا خون اور گوشت
وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ،	نہین پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا
(حج - ۵)	تقویٰ پہنچتا ہے،

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبون کی ضیافت کی جائے، اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے،

۳- اہل یمن کا دستور تھا، کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زاد راہ لے کر نہین چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہین، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ مین پہنچتے تھے، تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]،

---

[1] بخاری جلد ا صفحہ ۲۰۶ کتاب الحج،

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی، (بقرہ ۲۵-۳۵) زادِ راہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے،

۴- قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کرلئے تھے، انکی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانۂ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے[۱]، ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا استعارۃً دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا[۲]، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا، اور یہ آیت اتری،

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آیندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی[۳]،

۵- قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے

---

[۱] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت حمزہ سید الشہداء، [۲] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۶، کتاب الحج، [۳] صحیح بخاری کتاب الحج باب لایطوف عریان،

لیکن وہ خود حدودِ حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کردیا، چنانچہ یہ آیت[1] اتری،

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، (بقرہ ۴-۲۵)	کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں،

۶- صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پاگئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا[2]، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷- جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کردیا، اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی، اور ذکرِ الٰہی کا سرتاپا مرقع بنادیا، حکم آیا،

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ (بقرہ ۴-۲۵)	پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں نہ شہوت رانی کی باتیں کرنا اور نہ گناہ کرنا اور نہ لڑائی دنگا، اور تم جو نیکی کروگے اللہ کو معلوم ہوگی،

[1] بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۶، [2] بخاری جلد ۱ ص ۵۲۳،

۸- مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا،

فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَآ اِثۡمَ عَلَیۡہِ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثۡمَ عَلَیۡہِ لِمَنِ اتَّقٰی ،	جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا،
(بقرہ ۲۵-)	

۹- ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اُس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے[۱]

۱۰- خانۂ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے، کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر جانے کا

[۱] بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۴۱،

حکم دیا[۱]، اسی طرح عورتین خانۂ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھین آپنے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے[۲]، اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہین ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپنے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپنے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی[۳]،

۱۱- انصار حج کرکے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر مین نہین داخل ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود آتے تھے، اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کرکے آیا، اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر مین گھس آیا، تو لوگون نے اس کو بڑی لعنت وملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی[۴]،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہین ہے
مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	نیکی صرف اس کی ہے، جس نے تقوی
مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ	حاصل کیا، اور گھرون مین دروازے
اَبْوَابِهَا (بقرہ-۲۴)	کی راہ سے آؤ،

۱۲- بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقون سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، اور اسکو

---

[۱] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع [۲] ترمذی کتاب النذور والایمان [۳] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۹ کتاب الحج [۴] ایضاً صفحہ ۲۴۲،

پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت صلعم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی[1]، اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ[2]، ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی مین جڑے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو دونو نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کرینگے، آپ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کر دو یہ نذر نہین ہے[3]، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو،

۱۳ - اہلِ عرب ایامِ حج مین عمرہ نہین کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریان حج سے واپس آجائین اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہوجائین اس وقت عمرہ جائز ہوسکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے خاص ایامِ حج مین عمرہ کیا، اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا[4]،

۱۴ - جاہلیت کے زمانہ مین کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنون تجارت نہین کرتے تھے، اور اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لئے آتے تھے وہ حج مین شریک نہین ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازارون مین جمع ہوکر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونون طریقے الگ الگ جاری تھے، اسکا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیون کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف

---

[1] نسائی کتاب الحج صفحہ ۴۶۱ باب الکلام فی الطواف، [2] بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف
[3] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۰۶، [4] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ،

تماشائیون کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن مین ہر قسم کی برائیان جاری ہوتی تھین، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہدیا کہ تجارت اور بیوپار، حج کے تقدس وحرمت کے خلاف نہین، اس لئے یہ دونون فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہین، فرمایا،

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا	تمھارے لئے یہ گناہ نہین کہ (حج کے
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، (بقرہ - ۲۵)	زمانہ مین) فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہوگیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہوگئی،

۱۵- صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہوگئے تھے، انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے، جو مشلل مین قائم کیا گیا تھا، اور طواف نہین کرتے تھے، اُن کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا، اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہین ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلعم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

[۱] اس آیت کے شانِ نزول مین روایتین مختلف ہین، کچھ روایتون سے معلوم ہوتا ہو کہ اہل عرب حج مین تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لئے یہ آیت اتری اور دوسری روایتون مین ہو کہ اہل عرب ان دنون تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لئے ہوگیا، اسلئے اب اس مین تجارت مناسب نہین، یہ آیت اس خیال کی تردید کیلئے اتری، لیکن تمام روایتون کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہو جو اوپر متن کتاب مین لکھی گئی ہو، اور روایتون کے جمع کرنے سے اسکی تصدیق ہوتی ہو، (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی مین آیت مذکور) [۲] صحیح بخاری کتاب الحج جلد ۱ صفحہ ۲۲۳،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ (بقرہ ۱۹)

صفا و مروہ خدا کا شعار ہین، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے ان دونون کا پھیر لگانا گناہ نہین ہی،

حج کے ارکان

اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتین حسب ذیل ہین،

احرام، تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہین، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہین ہو سکتا نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت مین آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزین حرام ہو جاتی ہین، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھین، وہ شکار نہین کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا، بہرحال خود غرضی ہے، بی بی سے متمتع نہین ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتون سے احتراز کا موقع ہے، سلے ہوئے کپڑے نہین پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ مین یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہین رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑون کو اتار دین اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لیجائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیجائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کامون کیلئے باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تا کہ

اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار مین حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ بے تکلف، اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف، یعنی خانۂ کعبہ کے چارون طرف گھوم کر اور پھر کر دعائین مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد مین نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چارون طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چارون طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت مین وہ اپنی مغفرت کی دعائین اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے، جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر مین یہ ہوتا ہے، کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ "خداوندا ہم کو دنیا مین نیکی دے اور آخرت مین نیکی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا"

طواف حقیقت مین ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ "خانۂ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس مین بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت مین کچھ اور نہ بولو"[1] اور حکم ہوا کہ

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج-۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کرین،

حجر اسود کا استلام، "حجرِ اسود" کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہین، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانۂ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ مین قدِ آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانۂ کعبہ بیسیون دفعہ گرا

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم،

اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہدِ عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہلِ عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دوار میں لگا ہے، جس کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑیگا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکنِ شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کیلئے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے، مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفاے راشدین، صحابۂ کرام، ائمۂ اعلام، اکابرِ اسلام اور حکماے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے

دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کردیتا ہے، اور بااین ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے، جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا[2]" الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اُس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا،

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں، جو اب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی، اور آخر منادی غیب کی آواز سے رُک گئے، اور اسماعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتوں میں ہے، کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو لیکر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بیتاب ہوگئے تھے، تو حضرت ہاجرہؑ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی

---

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، [2] مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام،

ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہرحال حج مین پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہین، پھر اس سے اتر کر دعائین مانگتے ہوے مروہ پر آتے ہین، وہان بھی دعائین مانگتے ہین، کہ یہ دونون وہ مقامات ہین جہان ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؓ کو نظر آئے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ	بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعائر
فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ	ہین، تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ	کرے اس پر اس کا پھیرے لگانا
بِهِمَا، (بقرہ ۴ - ۱۹)	گناہ نہین،

وقوف عرفہ - عرفات مین نوین ذیحجہ کو تمام حاجیون کو ٹھہرنا، اور زوال کے بعد سے غروب تک یہان دعا، اور خدا کی حمد مین مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہان کوسون تک جہان تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس مین کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہون کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہین یہین جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوے حاجیون کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف مین ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلون مین مغفرت اور رحمت الٰہی

کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائین، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر مین ایسا ڈوب جاتا ہے، کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہجاتی ہے ؛

قیام مزدلفہ - حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ، اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت مین اگر منٰی کو براہِ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اس لئے انھون نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہین وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعرِ حرام کہتے ہین، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہان قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا،

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ	تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ	کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد
وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ	کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا، اور
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ	تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے
(بقرہ ۵ - ۲۵)	ہوئے تھے،

منٰی کا قیام - یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانگاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیان ہین[1]، رفتہ رفتہ جب مسلمانون کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی ترقی

[1] موطا امام مالک، باب ماجاء فی النحر فی الحج،

وسعت حاصل کی، اور قربانیون کی کوئی حد نہ رہی، اور وہ مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت مین بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کیلئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے یہان تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہین یہین قربانی کیجاتی ہے، باہم دعوتین ہوتی ہین، بازار لگتے ہین، خرید و فروخت ہوتی ہے،

جاہلیت مین عرب کے لوگ یہان جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادون کی بزرگی پر فخر کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہتر طریقہ یہ تھا، کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے، اور اس مقام کو قومون اور خاندانون کی مفاخرت کے بجائے مسلمانون کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ ۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنون مین یاد کرو،

قربانی یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام مین یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس مین لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو، اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائین

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ	اور مقررہ دنون مین خدا کا نام اس پر
مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ	لیا جائے جو جانور خدا نے روزی مین
مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا	دیا تو اس مین سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت

مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (حج-۴) — کے مارے فقیر کو کھلاؤ،

اگر بعض حالات مین قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھین، کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تشکیل ہے

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ — تو جو عمرہ اور حج دونون کا ساتھ فائدہ

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ — اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو

لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ — کرے، جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن

فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ — کے روزے حج مین، اور سات

(بقرہ ۲۴-۲۴) — دن واپس ہو کر،

حلق راس، منیٰ مین قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہین، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے[1] ساتھ ہی اس رسم مین ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد مین دستور تھا، کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا، اُس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی،[2] چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہی، اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی،

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ (فتح ۴) — اپنے سرون کو منڈا کر یا بال ترشوا کر،

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ — اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی

---

[1] تورات قاضی ۱۳-۵ گنتی ۶-۵ [2] ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص۳۷ و سیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ، واقعہ عمرو ابن امیہ و جز ناصیۃ و اعتقہ،

الھدیٰ محلہ، (بقرہ-۲۴) اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے،

رمی جمار - منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر انکے دل میں وسوسہ ڈالا، انھوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں، اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور اسی لئے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں، صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت ترمیھم بحجارۃ من سجیل میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی ترمیھم کی سنگ باری کی یادگار ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے، اس لئے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بت پرستی کے اس سب سے بڑے مظاہرہ کو سنگسار کیا جاتا ہے، بہرحال خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں، اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں،

چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بے کار کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرما دی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں

[1] مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی، و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح،

اشارہ کیا ہے،

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا، (بقرہ۔ ۲۵)

جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادون کو جیسے یاد کرتے تھے، ویسے ہی خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر،

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے،

ان رسوم کی غایت اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریقِ عبادت کی یادگار ہین، جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے، تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہون کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات واحساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہین، اور خدا کی یاد، اپنے گناہون کی مغفرت، اور آیندہ اپنی نیک زندگی گذارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیون مین جوڑ پیدا کرکے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا، کہ "کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے، اور خانۂ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہین ہے[1]" اور قرآنِ پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہی،

وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ، (حج۔ ۴)

اور تاکہ اُن مقررہ دنون مین خدا کا نام یاد کرو،

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج،

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہین، جہان پہنچکر اور جنکو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہین، اور اسی لئے قرآنِ پاک کی اصطلاح مین ان کا نام شَعَآئِرُ اللہ اور حُرُمٰتُ اللہِ ہے، یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتین اور چیزین، اور ان ہی شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج مین حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللہِ فَھُوَ	اور جو اللہ کی محترم چیزون کا ادب
خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ،	کرے، تو وہ اس کے پروردگار کے
(حج-۴)	نزدیک بہتر ہے،

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ	بیشک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہین،
شَعَآئِرِ اللہِ. (بقرہ-۱۹)	

اور سورۂ حج مین فرمایا،

ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللہِ	یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے
فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ، (حج-۴)	تو یہ دلون کی پرہیزگاری ہے،

ان آیتون سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روائتین وابستہ ہین، اُن کی یاد قائم رہے، اور دلون مین تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے،

حج کے آداب حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی، اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے،

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ، (بقرہ ۔ ۲۵)

تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ شہوت رانی کی باتیں کرنا اور نہ گناہ کرنا، اور نہ جھگڑا کرنا ہے، اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے،

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ، (مائدہ ۔ ۱) حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں،

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں، اُن کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا، کہ یہ اُس خانۂ الٰہی کے پاسِ ادب کے خلاف ہے تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے،

وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا، (مائدہ ۔ ۱)

اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے، جس کا نام کفارہ ہے، یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا،

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا	اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو
الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ	تو شکار کو مت مارو، اور تم میں جو جانور کو
قَتَلَہٗ مِنْکُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ	مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے
مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ	برابر بدلہ ہے مواشی میں سے، اس کا
یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ	فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ
ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ اَوْ	اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کیجائے
کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ اَوْ	یا اس کے گناہ کا اتار ہے، کچھ محتاجوں
عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا	کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے
لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ ۔ (مائدہ-۱۳)	تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے ،

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمامتر صلح و سلامتی، اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے،

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدے

منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہین، بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفۂ ربانی مین مذکور ہین،

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی زبان سے خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اسمٰعیلؑ کی نذر اور مکہ مین اُن کے قیام کے سلسلہ مین جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کو جامع ہے، آئیے ان آیتون پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لین،

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، (بقرہ ۔ ۱۵)	اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگون کا مرجع و مرکز اور امن بنایا، اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف کرنے والون اور کھڑے ہونے والون اور رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک و صاف کرو، اور جب ابراہیمؑ نے کہا، میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والون کو پھلوں سے روزی دے

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ	اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا
وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً	تابعدار گروہ بنا، اور ہماری اولاد مین
لَكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا	سے کچھ کو اپنا فرمبردار گروہ بنا، اور
وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ	ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور ہمکو معاف
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، رَبَّنَا	کر، تو بیشک معاف کرنے والا، رحم کرنے
وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	والا ہے، اے ہمارے پروردگار اور ان مین
مِنْهُمْ، (بقرہ-۱۵)	ان ہی مین سے ایک رسول بھیجنا،
وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ	اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ
الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي	ٹھکانا دی، کہ کسی کو میرا شریک بنانا، او
شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ	میرے گھر کو طواف کرنے والون،
وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ،	کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے
وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ	والون اور سجدہ کرنے والون کیلئے
يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ	پاک و صاف کر، اور لوگون مین حج
ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ	کا اعلان کردے، وہ تیرے پاس پیادہ
عَمِيقٍ، لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ	اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہوجانے
لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ	والی اونٹنیون پر سوار ہوکر، دور دراز
فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا	راستہ سے آئین گے، تاکہ فائدے کی

رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ
الْاَنْعَامِ،

(حج-۴)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ،
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِيْ
فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، رَبَّنَآ
اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ
تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ

(ابراهيم-٦)

جگهون مین اگر جمع ہون، اور چند مقرره
دنون مین اس بات پر خدا کا نام یاد کرین
کہ ہم نے ان کو جانور روزی کیے،
جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار
اس آبادی کو امن والی بنا، اور مجھے
اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم
بتون کی پوجا کرین، میرے پروردگار
ان بتون نے بہت سے لوگون کو گمراه
کیا، تو جس نے میرا کہا مانا وه مجھ سے
ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو
تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے
پروردگار! مین نے اپنی کچھ اولاد اس
بن کھیتی کی ترائی مین تیرے مقدس گھر
کے پاس آبادی کی ہے، ہمارے پروردگار!
تاکہ وه نماز کھڑی رکھین، تو لوگون کے
کچھ دلون کو ایسا بنا کہ وه ان کی طرف
جھکین، اور اُن کو پھلون کی روزی
دے تاکہ شکر گذار ہون،

ان آیتون مین حسب ذیل باتون کی تصریح ہے،

۱- خانۂ کعبہ اہلِ توحید کا ایک مرکز و مرجع، اور ملتِ ابراہیمی کا موطن ومسکن ہے،

۲- حضرت ابراہیمؑ نے یہان اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قومون کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے، تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر ان مین وہ رسول مبعوث ہو، جس کی صفتین ایسی ہون،

۳- یہ لوگ ایک ویرانہ مین جس مین کھیتی نہین، آباد ہوئے ہین، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہین، کہ تیرے گھر کو آباد رکھین، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین مین ان کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگون کے دلون کو ان کی طرف جھکانا، کہ وہ ان سے محبت کرین،

۴- حکم ہوا کہ لوگون مین اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہین گے، تاکہ یہان آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کرین، اور چند مقررہ ایام مین خدا کا نام لین،

۵- جو لوگ یہان عبادت اور حج کی نیت سے آئین، خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے،

۶- خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہون، آلِ ابراہیم ہین، اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤن اور برکتون کے مستحق ہین،

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہین جنمین سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہین،

مرکزیت، خانۂ کعبہ اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس مین اس کی رحمت وغفاری کی صفتین اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعون سے منور کرتی ہین، یہ وہ منبع ہے جہان سے حق پرستی کا چشمہ ابلا، اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنون نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشان کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جس مین ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہین جو مختلف ملکون اور اقلیمون مین بستے ہین، مختلف زبانین بولتے ہین، مختلف لباس پہنتے ہین، مختلف تمدنون مین زندگی بسر کرتے ہین، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہین، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہین، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدّن ومعاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آلِ ابراہیم) ایک ہی تمدنِ معاشرت (ملتِ ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) مین متحد ہو جاتے ہین، اور یہ وہ برادری ہے جس مین دنیا کی تمام قومین اور مختلف ملکون کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لعنتون مین گرفتار ہین، ایک لمحہ اور ایک آن مین داخل ہوتے ہین، جس سے انسانون کی بنائی ہوئی تمام زنجیرین اور قیدین اور بیڑیان کٹ جاتی ہین، اور تھوڑے دن کے لئے عرصۂ حج مین تمام قومین ایک ملک مین، ایک لباسِ احرام مین، ایک وضع مین، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہین، اور ایک ہی بولی مین خدا سے باتین کرتی ہین

یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کرکے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیا، آج دنیا کے لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملتِ ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومیں ہیگ" (ہولینڈ) میں اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں، لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوامِ عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے، جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں،

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظمِ حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے،

یہ حج کا موسم اُن کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس مین امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکون کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے، اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریقِ عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکوں کی رعایا اگر اگر اپنے والیون اور حاکمون سے کچھ شکایتین ہوتی تھین، تو ان کو خلیفہ کی عدالت مین پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی،

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائلِ حج کے فوراً ہی بعد، اللہ تعالیٰ نے ملک مین فساد اور بے امنی کی برائی کی، اور فرمایا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ	بعضے آدمی ایسے ہین کہ اُن کی بات
قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ	دنیا کی زندگی مین بھلی معلوم ہوتی ہو،
اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ	اور جو اس کے دل مین ہے اُس پر
اَلَدُّ الْخِصَامِ، وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى	وہ خدا کو گواہ بناتے ہین، حالانکہ وہ
فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا	بڑے درجہ کے جھگڑالو ہین، اور جب
وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ،	پیٹھ پھیرتے ہین تو ملک مین دوڑتے پھرتے
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ،	ہین، کہ اس مین بے امنی برپا ہو، اور
	تاکہ کھیتیان اور جانین تلف ہون،
(بقرہ ۲۵-۲۵)	اور اللہ فساد پیدا کرنے کو پسند نہین کرتا

پھر دو آیتون کے بعد فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي	اے ایمان والو، تم سب کے سب امن میں
السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا	داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ	پر مت چلو، کہ وہ تمہارا کھلا دشمن
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ، (بقرہ - ۲۵)	ہے،

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم مین اور سال بسال دور دراز اقلیمون، ملکون اور شہرون مین اُس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ مین یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا، اور سب نے سمعًا و طاعةً کہا، آپ کے بعد خلفاے راشدین اور دوسرے خلفاے زمانہ، صحابہ کرامؓ اور ائمۂ اعلامؒ نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکامِ اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشون مین اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہین،

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیون کے سلسلہ مین تمام دنیا مین پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آکر یہان سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشون سے آکر حرمِ ابراہیمؑ مین جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا مین متفرق و پراگندہ تھا، ابراہیمی درسگاہ کے صحن

مین ایک دفتر مین جمع کر دیتے تھے، یہین اگر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والون
سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری
سے، اندلسی، سندھی، (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم مین سندھ کا
علم اسپین مین، اور اسپین کی تحقیق سندھ مین پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف وروایت ترکستان مین،
اور ترکستان کا فیصلہ مصر وشام مین پہنچ جاتا تھا، عبد اللہ بن مسعودؓ کے شاگرد عبد اللہ
ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابوہریرہؓ کے مستفیدون سے، اور
انسؓ کے حلقہ کے فیضیاب علیؓ کے شاگردون سے مستفید وسیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا
جہان ائمۂ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے
تھے، اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابۂ کرام اور اُن کے تلامذہ اور مستفیدین کے
تمام دنیا مین پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وواقعات و
مغازی اور احکام وفرائض ووصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا، اور آپ کے سیر ومغازی
اور احادیث وتعلیمات مرتب ومدوّن ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آگئین، اور موطا، صحیح بخاری،
صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود مین آئے، اور ائمۂ مجتہدین کے لیے
یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے امامون کے خیالات ومعلومات سے مستفید ہو کر اجماعی
مسائل کو الگ کر سکین اور اس سے پہلے کہ کتابین مدوّن ہون اور پھیلین ہر ملک اور ہر شہر کے
علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات ومعلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے
حالات کے زیر اثر آج تک کم وبیش یہ سلسلہ قائم ہے،

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکون مین اپنے اپنے حالات مین گرفتار ہین، وہ دور دراز مسافتون کو طے کرکے اور ہر قسم کی مصیبتون کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کرکے یہان جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہین، جس سے ان مین باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہین آکر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے، جاوی بلغاری سے ملتا ہے، اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہین،

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے رنگ کو پہچاننے، اور سیاسیات کی پیچیدگیون کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے، اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیاے اسلام اور اسلامی ملکون کے حالات و واقعات کے لئے بےچین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنی سے ادنی مسلمانون کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملیگی، جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے مین سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانون مین بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہین، جنھون نے اصل مین حج کی نیت سے سفر کیا، اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام

سیاحت کی حیثیت اختیار کرلی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ مین مسلمانو مین جغرانی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفرِ حج کو قرار دیا ہے،

رزقِ ثمرات - اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شور و بیرانے مین بسنے والون کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی، کہ "خداوندا مین نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین مین آباد کیا ہے تو لوگون کے دل اُن کی طرف جھکانا، اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا" اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہان کے بسنے والون کے لئے زکوٰۃ وخیرات کی کوئی رقم خاص کیجاتی، لیکن یہ اُن لوگون کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگون کی نظرون مین ذلیل وخوار ہوجاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلون مین تجارت کا شوق پیدا کیا، اور اس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا جہان کہین پرانی تاریخون مین وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس مین ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ مین جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے بنی اسمٰعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے، (تکوین ۳۷ - ۲۰ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات مین عرب سوداگرون اور تاجرون کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے، جس کا ذکر سورہ "لایلاف قریش" مین ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر وروم تک جاتے تھے، [1]

[1] تفصیل اور حوالون کے لئے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارت العرب قبل الاسلام ۱۲

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، کہ یہ دعاے ابراہیمی کا مصداق، اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والون کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہان آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے مین یہان کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہین کہ وہ سال بھر کھا پی سکین، مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلون کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہین، اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہین، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہین، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہین، اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہلِ مکہ کے قوتِ لایموت کا ذریعہ بنتا ہے؛

قربانی کی اقتصادی حیثیت

اس ملک کی فطری پیداوارون مین اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانورون کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہلِ عرب اور اہلِ بادیہ کے لئے ان جانورون سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہین جنمین سے بعض کئی کئی کرتے ہین، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانورون سے کم کی قربانی نہین ہوتی، اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپیے، اور بکری کی چار روپیے وہان ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپیے ہر سال اہلِ بادیہ کو اپنے جانورون کی فروخت سے ملتے

ہیں، اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے،

ابراہیمی دعا کی مقبولیت | حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا،

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ،	اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں
(بقرہ - ۱۵)	میں سے روزی دینا،

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں، اور دعاے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے،

تجارت | قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے،

چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے،

وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ	اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ	والے گھر کے قصد سے جارہے ہوں
وَرِضْوَانًا،	اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی
(مائدہ - ۱)	تلاش کرتے ہوئے،

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں، کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا،

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے

بعد بعض صحابہ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر مین تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہین سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگون سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہین، کہ یہ تقوی کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے فرمایا،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ	اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو، کہ
التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی	راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقوی (بھیک
الْاَلْبَابِ، لَیْسَ عَلَیْکُمْ	نہ مانگنا) ہے، تم پر گناہ نہین ہے کہ
جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا	تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے
مِّنْ رَّبِّکُمْ ط (بقرہ - ۲۵)	ہوے چلو، (یعنی بیوپار کرتے ہوے)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر مین جائز نہین، درست نہ تھا، کہ اول تو "طلب رزق" ہر حال مین بجائے خود اسلام مین عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد مین ہے، کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی ترقی اور بقا ممکن نہین، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے، کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، یہ مقام گویا مسلمانون کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز، اور ممالک اسلامیہ کی صنعتون کی سالانہ نمائش گاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہان کی صنعت کا نمونہ یہان دیکھنے والے کو نظر نہین آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آجکل کے مسلمانون نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے، اور کچھ غیر مسلمانون کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہین،

اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں،

روحانیت۔ روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں، تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد، اور قرآن کا مہبط ہے، اس لئے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازوؤں سے اُڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں، تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے، اور اُن کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اُس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادرِ وطن (مدرلینڈ)

کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزیلینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں مین آباد ہین، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ مین اس وسیع برطانی مملکت کا جس مین آفتاب نہین غروب ہوتا، مرکز ہے، وہ اُن کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر ہر چیز مین اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہین، جب ان کی آنکھین اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہین تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب، اخلاق، اور تمدن کے ملک کو دیکھکر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہین، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اس وقت اُن کے دل مین وہ احساسات پیدا ہوتے ہین، جو دوسرے ملکون، قومون، اور تمدنون مین رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتون کو بیدار کر دیتے ہین، اور وہ یہان آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمۂ حیات مین نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہین، بلاتشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانون کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہین، ان مین سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اُس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے،

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک مین اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائین، تاکہ یہان اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف، اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستون سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہان آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روحِ ایمانی کو تازہ کر سکین، قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی "آبادیون کی مان" کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے،

تاریخیت - اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے، آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمامتر تعلق ارضِ حرم کے کوہ و صحرا اور در و دیوار سے ہے، یہین حضرت آدمؑ نے سکونت کی، اور عرش کے سایہ مین خدا کا گھر بنایا، یہین حواؑ نے آکر ان سے ملاقات کی، یہین نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہان پناہ لی، حضرت ابراہیمؑ نے یہان ہجرت کی، حضرت اسمٰعیلؑ نے یہین سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہان ولادت پائی، یہین وہ پہاڑی ہے (صفا) جہان حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہین وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہین وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم مین نظر آیا، یہین وہ خانۂ خدا ہے

جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہین وہ مقام ہے جہان کھڑے ہوکر انھون نے خدا کے آگے سر جھکائے، اسی کے قریب منیٰ، مشعرِ حرام، اور عرفات ہین، جو شعائر اللہ ہین یہین وہ پتھر (حجرِ اسود) ہے، جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھون سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہان ملتِ ابراہیمیؑ کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے، جہان اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہین وہ گلیان اور راستے ہین جو جبریلِ امین کے گذرگاہ تھے، یہین وہ غارِ حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی یہی وہ صحنِ حرم ہے جس مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترپن سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہان براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہین جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآنِ پاک کا اشارہ ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف نہین، جہان اس نے کہا،

فِیۡهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِیۡمَ ۚ (آل عمران - ۱۰) — اس حرم مین کھلے کھلے ربانی نشانات ہین، ابراہیم کے قیام کی جگہ،

ان مقامات، اور مناظر مین کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے، تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہین، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ مین تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھین اشکبار ہوتی ہین، اور زبان تسبیح و تہلیل مین مصروف ہو جاتی ہے، اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، (حج - ۴)	اور جو خدا کی نشانیون اور یادگارون کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلون کے تقویٰ کے سبب سے ہے،
وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ، (حج - ۴)	اور جو خدا کی حرمتون کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے،

خالص روحانیت۔ "حج کی حقیقت" مین گذر چکا ہے، کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہین، یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلین ہین، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰة نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہین بلکہ "حجِ مبرور" رکھا ہے یعنی "وہ حج جو سراپا نیکی ہو" اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتون کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلون کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت، اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد، اور آیندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے، اور اس کا اشارہ خود دعاے ابراہیمی مین مذکور ہے،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ	اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا، اور ہماری اولاد مین سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا، اور ہم کو

عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔	اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا، اور ہم پر رجوع ہو، (یا ہم کو معاف کر) تو (بندون کی طرف) رجوع ہونے والا (یا اُن کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے،
(بقرہ ۱۵-۱۵)	

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی، ان کی دوسری دعاؤن کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین مین حاضر ہو کر، جہان اکثر نبیون، رسولون اور برگزیدون نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات مین کھڑے ہو کر، اور چل کر خدا کی بارگاہ مین اپنی سیہ کاریون سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو، کہ وہ تو اپنے تائب گنہگارون کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکران ہے،

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہون کو اس طرح صاف کر دیتے ہین، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت مین گذارتا ہے، اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اس کے گناہون کو لے کر ڈوبتا ہے[1]"۔

---

[1] نسائی و ترمذی و بزاز و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب الحج جلد اوّل صفحہ ۱۶۳، میرٹھ،

صحیح مسلم اور نسائی مین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہین جس مین خدا اپنے بندون کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندون سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے ان بندون پر فرشتون کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ جو انھون نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) موطا امام مالک مین ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ "بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہین ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہین" اسی طرح اور بہت سی حدیثین ہین جنمین مخلصانہ حج ادا کرنے والون کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثین درحقیقت اسی دعاے ابراہیمی وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیرین ہین،

ان تمام بشارتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ "خداوندا مین حاضر ہون مین حاضر ہون" کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف مین، سعی مین، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات مین، مزدلفہ مین، منیٰ مین، ہر جگہ جو دعائین مانگی جاتی ہین، ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ[1] "گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہین ہے، اسی لئے حج مبرور والے کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہین،

[1] سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ،

گوکہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہین، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہین؛ لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگون تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ وہ جو یہان کے سوا اور کہین نہین، صدقِ توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہین ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب مین ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہان انبیاء علیہم السلام پر برکتون اور رحمتون کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہگارون کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و زاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہان خدا اور اس کے برگزیدہ بندون کے بیسیون ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہین، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہین جہان حضرت آدمؑ و حواؑ نے اپنے گناہون کی معافی کی دعا کی، جہان حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہان حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہان دوسرے پیغمبرون نے دعائین کین، جہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائین مانگین وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤن کے وہی ارکان، ہم گنہگارون کی دعاے مغفرت کے لئے کس قدر موزون اور مناسب ہین، کہ پتھر سے پتھر دل بھی، ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہین، اور انسان اس ابرِ کرم کی چھینٹون سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہان برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آن ابرِ رحمت دُرفشان است،

انسان کی نفسیت (سائکالوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی

ہیں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہاں پہنچکر اس کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد، یا تعلیم سے فراغت کے بعد، یا کسی نوکری کے بعد، یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد، یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُن کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں، جہاں سے اِدھر یا اُدھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، اُن بابرکت مقاموں پر حاضر، اور وہاں کھڑے ہو کر، جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے، خدا کے گھر کے سامنے، قبلہ کے روبرو جو اسکی نماز و اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف، اور آیندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف، زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے، اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوات نے یہ فرمایا،

من حج للہ فلم یرفث ولم　　　جس نے خدا کے لئے حج کیا، اور اس

یفسق رجع کیوم ولدتہ	مین ہوس رانی نہ کی، اور نہ گناہ کیا، تو وہ [illegible]
امہٗ،	ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسے اس دن تھا، [illegible]

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس مین دین اور دنیا دونون کی بھلائیان جمع اور دونون کی کامیابیان شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآنِ پاک کی ان آیتون کا خلاصہ ہے، جو حج کے باب مین ہین، اور حج کی آخری آیتین، طواف کی دعا، کا آخری ٹکڑہ ہین،

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ	پھر طواف کے لئے وہین سے چلو جہان
النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ	سے لوگ چلے، اور خدا سے اپنے گناہ
اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ، فَاِذَا	کی معافی مانگو، بیشک خدا معاف کرنے
قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا	والا اور رحم کرنے والا ہے، اور جب
اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ	حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو
ذِکْرًا، فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ	اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپ
رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ	دادون کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی
فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ	زیادہ، تو بعض لوگ (حج کی دعا مین)
مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا	کہتے ہین، اے ہمارے پروردگار!
حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً	ہم کو دنیا مین دے، اور ایسون کیلئے
وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اُولٰٓئِکَ لَهُمْ	آخرت مین کوئی حصہ نہین، اور بعض وہ

لہ سنن ابی داود کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے،

نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا وَاللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ، (بقرہ ۔ ۲۵)

ہین، جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پرورگار ہم کو دنیا مین بھلائی دے اور آخرت مین بھی بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہین جنکو اپنی کمائی کا حصہ ملیگا، اور اللہ تمھارے اعمال کا تم سے

[illegible]

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہین، مثلاً

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریون کا احساس کرسکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے، جب اہل وعیال کی ضرورتون کا سامان کرلیتا ہے، اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریان خود بخود محسوس ہوجاتی ہین، معاملات مین قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے، اور حج وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہوجائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے،

عام طرز معاشرت اور دنیوی کامون مین آدمی اپنے سیکڑون دشمن پیدا کرلیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ مین جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لئے اس رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کرلیتا ہے، لوگون سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھون کو مناتا ہے، قرض خواہون کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے،

۲- اسلام آج ہر ملک مین ہے، اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہان دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہین، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر مین کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہین، اسکا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اُس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے،

۳- مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمایش حج کے زمانہ مین ہوتی ہے، جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا، ایک لباس مین، ایک صورت مین، ایک میدان مین ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہین، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید،

۴- بہت سی اخلاقی خوبیون کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف مین مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے،

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہین، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانون کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے،

جہاد

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج - ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا، مگر قرآن پاک اور احادیثِ نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دیجائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں اُن کو اٹھایا جائے،

"جہاد" کے معنی عموماً قتال، اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے،

"جہاد" کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اور اس کی اشاعت، اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدو جہد، قربانی، اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی ومالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں

کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر اُن سے لڑنا پڑے، تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے،

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ" کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے، یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے، آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد ان ہی کے مطابق عملِ خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں "جہاد" کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے،

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ	مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی
الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ	معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں اور
وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ	وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ	سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ
اللهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ	نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں

وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ	کو بیٹھنے والون پر درجہ کی فضیلت عطا
دَرَجَةً ۙ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ	کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے
الْحُسْنٰى ۙ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ	بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے
عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ (نسآ - ۱۳)	والون کو بیٹھنے والون پر بڑے اجر

فضیلت بخشی ہے

اس "بیٹھنے" اور "جہاد" کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے، کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے،

یہان ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہین کہ "جہاد" اور "قتال" دونون ہم معنی ہین، حالانکہ ایسا نہین ہے، قرآن پاک مین دونون لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہین، اس لئے "جہاد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین جہاد کرنا) اور "قتال فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین لڑنا) ان دونون لفظون کے ایک معنی نہین ہین، بلکہ ان دونون مین عام وخاص کی نسبت ہے، یعنی ہر "جہاد" "قتال" نہین ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسمون مین سے ایک قتال اور دشمنون سے لڑنا بھی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین ان دونون لفظون کے استعمال مین ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورۂ نسآء کی اوپر کی آیت مین اور دوسری آیتون مین جہاد کی دو صریح قسمین بیان کی گئی ہین، "جہاد بالنفس" اور "جہاد بالمال" یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہانتک کہ اپنی جان تک کو جوکھون مین ڈال دینے، آگ مین جلائے جانے سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے مین چھد جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت

آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم دونون کی ترقی وسعادت کی راہ مین رکاوٹ ہے، اگر یہ دونون بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائین تو ہم کامل موحد ہو جائین، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہین سکتی، جسمانی وروحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہین،

ترقی وسعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصولِ ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ مین مسلمانون نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفون کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق وزنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچون سے علحدگی، مال ودولت سے دست برداری، اور گھربار سے دوری کوئی چیز بھی اُن کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ مین انھون نے تلوار کی چھاؤن مین جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مومن وہی ہین جو اللہ اور اس کے رسول
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	پر ایمان لائے، اور پھر اس مین وہ ڈگمگائے
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	نہین، اور خدا کے راستہ مین اپنی جان
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ، (حجرات - ۲)	اترنے والے لوگ ہین،
فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	پھر جنھون نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے
مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ	گھرون سے نکالے گئے، اور میری راہ
وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	مین ستائے گئے، اور لڑے اور مارے
سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	گئے ہین اُن کے گناہوں کو اُن سے اتار دونگا
جَنّٰتٍ ، الآیہ (آل عمران - ۲۰)	اور ان کو بہشت مین داخل کردونگا،

جہاد کی قسمین

۱- جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، اور جد و جہد کے ہین تو ہر نیک کام اس کے تحت مین داخل ہو سکتا ہے، علماے دل کی اصطلاح مین "جہاد" کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کیساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام اُن کے ہان "جہادِ اکبر" ہے، خطیب نے تاریخ مین حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے، کہ آپ نے اُن صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا "تمھارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہواے نفس سے لڑنا ہے" حدیث کی دوسری کتابون مین اس قسم کی اور بعض روایتین بھی ہین[1] چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابو ذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے" یہی روایت دیلمی مین ان الفاظ مین ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کیلئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو" یہ تینون روایتین گو فن کے لحاظ سے چندان مستند نہین ہین مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثون کی تائید، اور قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر ہین،

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا	اور جنھون نے ہمارے بارہ مین جہاد

۱؎ بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۵۰۷ حیدرآباد دکن،

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ، (عنکبوت ۔ ۷)

کیا، (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم انکو اپنا راستہ آپ دکھائینگے اور بے شبہ خدا

اس پورے سورہ مین اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف مین ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبرون کے کارنامون کو ذکر کیا ہے، کہ وہ ان مشکلات مین کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنون کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز مین ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ، (عنکبوت - ۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والون سے بے نیاز ہے،

اور سورہ کے آخر مین فرمایا کہ "ہمارے کام مین یا خود ہماری ذات کے حصول مین، یا ہماری حق کی طلب مین جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کیلئے اپنی تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دینگے، اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائین گے" یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیو ن کا وسیلہ ہے، سورۂ حج مین ارشاد ہوا،

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ

اور محنت کرو اللہ مین پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمہارے دین مین تم پر کوئی تنگی نہین کی تمہارے

اٰبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ ، (حج - ۱۰) باب ابراہیم کا دین ،

یہ "اللہ میں محنت اور جہاد کرنا" وہی جہادِ اکبر ہے، جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے[1]، کہ آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاهد من جاهد نفسه" یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے" صحیح مسلم میں ہے، کہ ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے، جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے[2]" یعنی جو اُس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اُس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے ،

۲ - جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ، (نحل - ۱۶)

تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور ان سے نہایت عمدہ طریقہ سے مباحثہ کر،

---

[1] بحوالہ کنز العمال کتاب الایمان جلد ۱ ص ۳۹ ، [2] صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب جلد ۲ ص ۳۹۶ ، مصر ،

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دیگئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ	تو کافروں کا کہا نہ مان، اور بذریعہ
بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا، (فرقان ۵)	قرآن کے توان سے جہاد کر، بڑا جہاد

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر "بڑا جہاد" اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا، ہو، اور اس کو جہاد کا اہم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے،[۱] ہر ایک مسلمان کا فرض ہو کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور اُن کو اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں انکو اس لئے حاصل کرے کہ اُن سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ

---

[۱] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۹،

علم کا جہاد ہے، جو اہلِ علم پر فرض ہے،

۲- جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستون مین خرچ کیا جائے یہانتک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسایش کے لئے بھی خرچ کیا جائے، تو اسی کی مرضی کیلئے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہین، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہین ہے، دوسری اجتماعی تحریکون کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد مین سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانون کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سی سخت گھڑیون مین جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہین اور ان ہی سپرا ہیون سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھون سرسبز و شاداب ہوا، اور اسی لئے اسلام مین ان بزرگون کا بہت بڑا رتبہ ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، (انفال - ۱۰)	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا،

قرآنِ پاک مین مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتین ہین، بلکہ یہ مشکل کہین جہاد کا

حکم ہوگا، جہان اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ ان مین سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے،

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا	ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو،
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور اپنے مال اور اپنی جان سے
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	خدا کے راستے مین جہاد کرو، یہ تمھارے
تَعْلَمُوْنَ ، (توبہ - ۶)	لئے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ	مومن وہی ہین، جو اللہ اور رسول پر
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ	ایمان لائے، پھر اس مین شک نہین
لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا	کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ	خدا کے راستہ مین جہاد کیا، یہی
سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ، (حجرات - ۲)	سچے اترنے والے ہین،
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ	اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والون
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى	کو اللہ نے بیٹھ رہنے والون پر ایک
الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ، (نساء - ۱۳)	درجہ کی فضیلت دی ہے،

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتین ہین،

میدانِ جنگ مین ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہین، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان ہے،

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے،

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اُس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے،

گر جان طلبی مضائقہ نیست | گر زر طلبی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھکر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

۴۔ جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دیجائے، ارشاد ہوا کہ تمہارا جہاد نیک حج ہے[1] کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنفِ نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمتِ اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی جی ہاں فرمایا "ففیھما فجاھد" تو تم اُن ہی کی خدمت میں جہاد کرو[2]، یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے آپ نے فرمایا

ان من اعظم الجہاد کلمۃ عدلٍ عند سلطانٍ جائرٍ (ترمذی ابواب الفتن)

ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہدینا ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد، [2] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد،

۵- اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے اُن تمام اقسام کو شامل ہے جن مین انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ مین نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنون سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائین تو اُن کو راستہ سے ہٹانا، اور اس صورت مین اُنکی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ مین قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخشدیجائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دیجائے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي	جو خدا کی راہ مین مارے گئے، اُن
سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ	کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہین، لیکن
وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۔ (بقرہ-۱۹)	تم کو اس کا احساس نہین،

آلِ عمران مین ان جانبازون کی قدر افزائی ان الفاظ مین کی گئی ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا	جو خدا کی راہ مین مارے گئے ان کو
فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ	مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہین،
أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ	اپنے پروردگار کے پاس اُن کو روزی
فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن	دی جارہی ہے، خدا نے اُن کو اپنی
فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ	جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش
لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ	ہین، اور جو آج تک اُن سے اس

اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	زندگی مین ہونے کی وجہ سے نہین ملے
يَحْزَنُوْنَ	ہین، اُن کو خوشخبری دیتے ہین کہ انکو
(آل عمران - ۱۷)	نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم مین ہین،

ان جان نثارون کا نام شریعت کی اصطلاح مین "شہید" ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہین،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراہن مین قیامت کے دن اٹھین گے[۱] اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی مین انھون نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی مین پائین گے، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ، (آل عمران - ۱۴) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان مین اترے تھے، لیکن اُن کے سر کا ہدیہ دربارِ الٰہی مین اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا، کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارخانہ ختم نہین ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسنِ نیت کے بدولت رضاے الٰہی کی سند پائین گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے "غازی" کے لقب سے یاد کرتے ہین،

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور جو خدا کی راہ مین لڑتا ہے، پھر وہ
فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ	یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم
اَجْرًا عَظِيْمًا، (نساء - ۱۰)	اس کو بڑا بدلہ عنایت کرینگے،
فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	تو جنھون نے میری خاطر گھر بار چھوڑا

[۱] صحیح مسلم کتاب الجہاد

مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي
وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ
حُسْنُ الثَّوَابِ،
(آل عمران - ۲۰)

اور اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور ان
کو میری راہ مین تکلیفین دی گیئن، اور
وہ لڑے اور مارے گئے، ہم اُن کے
گناہون کو چھپا دینگے، اور اُن کو جنت
مین داخل کرینگے، جس کے نیچے نہرین
بہتی ہونگی، خدا کی طرف سے اُن کو یہ
بدلہ ملیگا، اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے،

ان آیات کی تفسیر و تشریح مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث مین مذکور ہے، جس مین شہیدون کی فضیلتین، اور اُن کی اُخروی نعمتون کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ مین ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانون مین مشکلات کے مقابلہ اور دشمنون سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانون کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے، اور اس حیات جاوید کی تلاش مین ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ مین خدا کی راہ مین مارا جاؤن، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور مین اس کو بھی قربان کردون، اور پھر تیسری زندگی ملے، اور اس کو بھی مین خدا کی راہ مین نثار کردون[1]" ذرا ان فقرون پر ایک بار اور نگاہ ڈال

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

لیجیے، ان مین یہ نہین ہے کہ مین دوسرے کو مار ڈالون، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ مین مین مارجاؤن اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤن پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤن،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ۔۔۔ ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد ۔ یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہین آتا، اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر مین ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ مین دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبون کی مدد، زیر دستون کی امداد، سیہ کارون کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِ ظلم، اور احکامِ الٰہی کی تعمیل مین ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہانتک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بنجائے، اور اسکی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آلِ عمران کی جس مین جہاد کے مسلسل احکام مین آخری آیت ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، (آل عمران - ۲۰۰)

اے ایمان والو! مشکلات مین ثابت قدم رہو، اور مقابلہ مین مضبوطی دکھاؤ، اور کام مین لگے رہو، اور خدا سے ڈرو، تاکہ تم مراد کو پہنچو،

یہی وہ جہادِ محمدی ہے، جو مسلمانون کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے،

عباداتِ قلبی

یہ اسلام کے اُن عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہین، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان مین بھی ہے، لیکن اسلام مین بعض ایسی عبادات بھی ہین، جنکا تعلق تمامتر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتون سے ہی، پہلے معلوم ہو چکا ہی، کہ اسلام مین ہر نیکی کا کام عبادت ہے اس لئے تمام امورِ خیر خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہون عبادلت کے اندر داخل ہین، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہی لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کیساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہی، اصل یہ ہی کہ فقہا نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فرضیون تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اُن سارے فرضیون کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہی، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآنِ پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام مین ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جنکا مرتبہ عباداتِ پنجگانہ کے بعد قرآنِ پاک مین سب سے زیادہ

نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہین، یہ وہ فرائض ہین، جنکا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور اسی لئے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہین جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہین، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جنپر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بنجاتے ہین، یہ بات گو یہان بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوّف کی ایک دوسرے سے علٰحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمالِ تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے،

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل مین خیر و شر کی تمیز کے لئے خلش ہو، یہ **تقویٰ** ہے، پھر اس کام کو خداے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ **اخلاص** ہے، پھر اُس کام کے کرنے مین صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ **توکل** ہے، اُس کام مین رکاوٹین اور دقتین پیش آئین، یا نتیجہ مناسبِ حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے، اور خدا سے آس نہ توڑی جائے، اور اس راہ مین اپنے برا چاہنے والون کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ **صبر** ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اُس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، اور جسم و جان و زبان سے اُسکا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کامون کے کرنے مین اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے، یہ **شکر** ہے،

ذیل کی سطرون مین اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے،

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے

اگر محمد رسول اللہ صلعم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک

لفظ مین کرنا چاہین تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہین، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب مین اسی تقوی کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ مین یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہین جو تقویٰ والے ہین،

هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، (بقرہ-۱) — یہ کتاب تقویٰ والون کو راہ دکھاتی ہے

اسلام کی ساری عبادتون کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ-۳) — اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمھارے پہلون کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقوی پاؤ،

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، (بقرہ-۲۳) — تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگون پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو،

حج کا منشا بھی یہی ہے،

وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ، (حج-۴) — اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان ومقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلون کے تقویٰ سے ہے،

قربانی بھی اسی غرض سے ہے،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا	خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور
دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى	خون نہین پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ
مِنْكُمْ، (حج-۵)	اس کو پہنچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے،

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى	جس نے اپنی عمارت خدا سے تقویٰ
تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ، (توبہ-۱۲)	پر کھڑی کی،
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى	البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ
(توبہ-۱۳)	پر قائم کی گئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ مین راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ	اور سفر مین زادِ راہ لے کر چلو، اور
التَّقْوٰى، (بقرہ-۲۵)	سب سے اچھا زادِ راہ تقویٰ ہے،

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ، (اعراف-۳)	اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے،

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے،

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى،	اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب
(بقرہ-۳۱)	تر ہے،

اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (مائدہ-۲) — انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے،

وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ، (آلعمران-۱۹) — اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ کرو، تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے،

وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ ، (بقرہ-۲۸) — اور تقویٰ کرو، اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ،

وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ، (نساء-۱۹) — اور اگر اچھے کام کرو، اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے،

اہلِ تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں ان ہی تقویٰ والوں کا حصہ ہے،

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ مَقَامٍ اَمِيۡنٍ ، (دخان-۳) — بے شبہ تقویٰ والے امن وامان کی جگہ میں ہوں گے،

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّنَعِيۡمٍ (طور-۱) — بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے،

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوۡنٍ ، (ذاریات-۱) — شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے،

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ، (قمر-۱) — بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہونگے،

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ ظِلٰلٍ وَّ — بلاشبہ تقویٰ والے سایوں میں

وَّعُيُوْنٍ ، (مرسلات - ۱)	اور چشمون مین ہون گے ،
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ	یقیناً تقویٰ والون کے لئے اُن کے پروردگار
جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ، (ن - ۲)	کے پاس نعمت کے باغ ہین ،
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ، (نباء - ۲)	بے شبہہ تقویٰ والون کیلئے کامیابی ہے
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ، (ص - ۴)	لاریب تقویٰ والون کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے ،

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے ،

گو بظاہر ابتدا مین اہلِ تقویٰ کو کسی قدر مصیبتین اور بلائین پیش آئین ، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزون سے محروم ہونا پڑے ، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششون اور ناروا راستون سے پرہیز کرنا پڑے ، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ اُن کو مال و دولت ، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی ، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہین ، اور یہ خیال کرتے ہین کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمرون کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجون کا فیصلہ کر لینا چاہئے ، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے ، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہین بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے حقیقی دوربین اور عاقبت اندیش وہ ہین ، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چندروزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہین ، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہین ، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمرون پر رہتی ہے ، تو دنیا بھی اُن کی بنجاتی ہے ، اور یہان اور وہان دونون جگہ کامیابی اور فوز و فلاح اُن ہی کی قسمت مین ہوتی ہے ، فرمایا ،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (اعراف ۱۵)	اور آخری انجام تقویٰ والون کیلئے ہے
اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (هود-۴)	بے شبہہ انجام کار تقویٰ والون کیلئے ہے
وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (زخرف - ۳)	اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والون کے لئے ہے ،
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ، (طٰہٰ - ۸)	اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے ،

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہین

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہین، جب وہ ہر کام مین خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہین، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہردلعزیزی کی صورت مین نہین چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندون مین بھی اُن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہردلعزیزی پیدا ہوتی ہے ،

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ، (انفال)	تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہین ،
فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (آل عمران)	تو اللہ بے شک تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے ،
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (توبہ-۱)	اللہ بلاشبہہ تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے ،
وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (جاثیہ-۲)	اور اللہ تقویٰ والون کا دوست ہے ،

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہین

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہین، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے ،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ	اور جان لو کہ بے شبہہ اللہ تقویٰ والون
(بقرہ-۲۴)	کے ساتھ ہے،
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ	اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ
(توبہ-۱۶-۵)	والون کے ساتھ ہے،

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے، ایک کام ہزارون اغراض، اور سیکڑون مقاصد کو سامنے رکھکر کیا جا سکتا ہے، مگران مین اللہ تعالیٰ صرف اُن ہی کے کامون کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہین فرمایا،

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ	اللہ تو تقویٰ والون ہی سے قبول
(مائدہ-۵)	فرماتا ہے،

اسی لئے اُن ہی کے کامون کو دنیا مین بھی بقا، قیام اور ہردلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت مین بھی،

تقویٰ والے کون ہین یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتین اہلِ تقویٰ ہی کے لئے ہین، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہین، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے، جو سورۂ زمر مین ہے،

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ	اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا
صَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	وہی لوگ ہین تقویٰ والے، ان کیلئے

الْمُتَّقُوْنَ، لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزَآءُ (زمر) | ان کے رب کے پاس وہ ہے جو چاہین، یہ ہے بدلہ نیکی والون کا،

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو مین سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام مین ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہین، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہین چاہتا، لیکن اہلِ تقویٰ کا پورا حلیہ سورۂ بقرہ مین ہے،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	پر اور فرشتون پر اور کتاب پر اور پیغمبرون
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	پر ایمان لایا، اور اپنا مال اس کی محبت
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	پر رشتہ دارون، یتیمون، مسکینون
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	مسافر اور مانگنے والون کو اور گردنون
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ	کے آزاد کرانے مین دیا، اور نماز کو برپا
فِي الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کرکے
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ	اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہین،
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج	اور سختی، تکلیف، اور لڑائی مین صبر
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	کرنے والے ہین، یہی وہ ہین جو

وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ-۲۲)

سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہین،

ان آیتون مین تقویٰ والون کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط وخال نمایان کردیا گیا، اور بتادیا گیا ہے، کہ یہی خدا کی نگاہ مین سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہین،

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے

تقویٰ اصل مین وَقْوٰی ہے، عربی زبان مین اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہین، لیکن وحیِ محمدیؐ کی اصطلاح مین یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل مین خیر وشر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کردیتی ہے، دوسرے لفظون مین ہم یون کہہ سکتے ہین کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام مین خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل مین دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآنِ پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، (حج-۴)

اور جو شعائرِ الٰہی کی تعظیم کرتا ہی تو وہ دلون کے تقویٰ سے ہے،

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجاے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلون مین تحریک پیدا، اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم سے اُن کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیتِ کریمہ مین ارشاد ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ	بے شک جو لوگ رسول اللہ کے
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ	سامنے دبی آواز سے بولتے ہین،
الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ	وہی ہین جن کے دلون کو اللہ
لِلتَّقْوٰی لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ	نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، انکو
عَظِیْمٌ، (حجرات -۱)	معافی ہے اور بڑا بدلہ،

اس آیت مین بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت مین تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے،

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا،	تو ہر نفس مین اس کا فجور اور اُس کا
(الشمس -۱)	تقویٰ الہام کر دیا،

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیون کی بنیاد، اور اصل الاصول ہے، اور دونون بندہ کو فطرۃً ودیعت ہین، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونون الہام ربانی ہین، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقویٰ کا مقام ہے،

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے، اور اُن سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کرلیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا،

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ	اور جب کفار نے اپنے دلون مین
قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ	پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ نے
الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ	اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانون
عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ	پر اُتارا، اور اُن کو تقویٰ کی بات
وَاَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی	پر لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے
وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، (فتح-۳)	لائق، اور اس کے اہل،

یہان جنگ و خونریزی سے احتراز، خانۂ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت مین دشمنون کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والون کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے،

فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی	تو تم ان کے عہد کو اُن کی مقررہ
مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ	مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والون
الْمُتَّقِیْنَ، (توبہ-۱)	کو پیار کرتا ہے،
فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا	تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہین
لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ،	تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو، خدا
(توبہ-۲)	تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کامون کی مشق اور کثرت سے

بڑھتا جاتا ہے، اس طرح اچھے کامون کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت مین ترقی ہوتی ہے،

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ	جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے اُن کی
هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ	سوجھ اور بڑھائی اور اُن کو اُن کا
(محمد - ۲)	تقویٰ عنایت کیا،

اس سے عیان ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت، اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے،

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع مین ارشاد فرمایا،

التقوىٰ هٰهُنا، (مسلم)	تقویٰ یہان ہے،

اور یہ کہکر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیون کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآنِ پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتون کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعلیمون کا ماحصل قرار پایا،

اسلام مین برتری کا معیار

اسلام مین تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب، غرض نوعِ انسانی کے ان

صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا،

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ	صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت
	ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک
	سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے
(حجرات - ۲)	زیادہ تقویٰ والا ہے،

اس اعلان کو آنحضرت صلعم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، الکرم التقوی، یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلانِ عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے، جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہو"۔

اخلاص

مُخلِصِینَ لَہُ الدِّین (بینہ)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہون یا عبادات، اخلاق ہون یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ مین اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلعم نے ایک مشہور حدیث مین یون ظاہر فرمایا ہے،

الا وان فی الجسد مضغۃً	ہشیار رہو کہ بدن مین گوشت کا ایک
اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ	ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا
واذا فسدت فسد الجسم کلہ	بدن درست ہوتا ہے، اور وہ خراب
الا وھی القلب[1]،	ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے'
	ہشیار رہو کہ وہ دل ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرء لدنیہ، وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات،

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت، طلبِ شہرت یا طلبِ معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجاآوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسولؐ کو حکم ہوتا ہے،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ	تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے
الدِّيْنَ، اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ	اطاعت گذاری کو اسی کے لئے سُنتا
الْخَالِصُ ط (زمر-۱)	کہ اللہ ہی کے لئے ہو خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بُت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ	کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی
هَوٰىهُ ط (فرقان-۴)	خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے،

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بُت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ	کہدے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ قُلْ إِنِّيْ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (زمر-۲)

اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کرکے اس کی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار ہوں، کہدے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لئے خالص کرکے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جسکی عبادت چاہے کرو،

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے،

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، — اطاعت گذاری کو خدا کیلئے خالص کرکے،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی، اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو، إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى (لیل-۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں،

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ — اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — نہین چاہتا میری مزدوری تو بس

(شعراء - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ - ۱۰) — پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا،

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا — اے میری قوم! مین تم سے اس پر

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ، — دولت کا خواہان نہین، میری مزدوری

(ھود - ۳) — تو خدا ہی پر ہے،

خود ہمارے رسول صلعم کو یہ کہدینے کا فرمان ہوا، مین تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت نہین چاہتا، اگر چاہتا بھی ہون تو تمھارے ہی لئے،

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ — کہدے کہ مین نے تم سے جو اجرت

فَھُوَ لَکُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی — چاہی تو وہ تمھارے ہی لئے، میری

اللّٰہِ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ — اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر

(سبا - ۶) — گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتون سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کے لئے ہے، دوسری جگہ فرمایا،

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا — مین اس پر تم سے کوئی مزدوری نہین

الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی، (شوریٰ - ۳) — چاہتا، مگر قرابت دارون مین محبت رکھنا

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششون سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اسکے لئے

وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہان نہین، اگر وہ اس کے معاوضہ مین کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت دارون کا حق ادا کرو، اور آپس مین محبت رکھو،

اسی قسم کی بات ایک اور آیت مین ظاہر کیگئی ہے،

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ	کہدے کہ مین تمھاری اس رہنمائی پر
اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ	تم سے کوئی معاوضہ نہین مانگتا مگر
اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا،	یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی
(فرقان - ۵)	طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم مین سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلین،

دنیا مین بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اسکی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمایش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً انکی آنکھون سے گرجائیگی، اسی طرح روحانی عالم مین بھی خدا کی نگاہ مین اس چیز کی کوئی قدر نہین جو اس کی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کیلئے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیالِ مزد و اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی درین تو الگ رہا دنیا بھی اُن ہی کو ادا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انھون نے اپنا کام ان ہی شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے،

ہم جو کام بھی کرتے ہین اس کی دو شکلین پیدا ہوتی ہین، ایک مادی جو ہمارے ظاہری

جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جسکا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت، اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونون مین اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت مین ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام مین نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہین، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھین، تورات اور قرآن دونون مین ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹون کا قصہ ہے، دونون نے خدا کے حضور مین اپنی اپنی پیداوار کی قربانیان پیش کین، خدا نے ان مین سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا،

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (مائدہ-۵)	خدا تو متقون ہی سے قبول کرتا ہے،

متقی بھی وہی ہوتے ہین، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہین، ان ہی کا کام قبول ہوتا ہے، اور اُن کو دین و دنیا مین فوز و فلاح بخشا جاتا ہے اُن کو خدا کے یہان محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور دنیا مین اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کامون کو شہرت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے کارنامون کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتون اور قومون کے محسن ہوتے ہین، لوگ اُن کے ان کامون سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہین، اور اُن کے لئے رحمت کی دعائین مانگتے ہین، حضرت موسیٰؑ کے عہد مین فرعونیون کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہین آتا تھا، کہ ان دونون سے انھون نے عجائب و غرائب

امور کا یکسان مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونون کے عجائب و غرائب مین ظاہری نہین باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لئے یہ فیصلہ ہے کہ

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ، (طٰہٰ - ۳) اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہین پائے گا،

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگرون کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بنکر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتون تک دنیا مین قائم رہی،

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ مین تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خودبخود حل ہو جائیگا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیون ضروری قرار دیا ہے،

توکّل

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (آل عمران ۱۷۰)

توکل قرآنِ پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہین، کہ کسی کام کے لئے جدّوجہد اور کوشش نہ کیجائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤن توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ مین بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا یعنی تقدیر مین جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہین، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اپاہجون کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرّہ بھر بھی تعلق نہین،

توکّل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہین، اور اصطلاح مین خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہین، لیکن کس بات مین بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے مین یا نہ کرنے مین؟ جھوٹے صوفیون نے ترکِ عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسرون کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام مین بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس مین ضرور ہی

ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جد وجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا مین لوگون کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبرون کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جد وجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ مین جان ومال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر واُحد اور خندق وحنین مین سوارون، تیراندازون، زرہ پوشون، اور تیغ آزماؤن کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکل مسلمانون کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگون سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کردو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو، کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت ومصلحت اور مشیئت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جد وجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل وکرم ہوا، اور اُسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آلِ عمران مین ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج	اور کام (یا لڑائی) مین اُن سے مشورہ
فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى	لے لو، پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ
اللّٰهِ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ	پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ)

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(آل عمران - ۱۷)

بھروسہ رکھنے والون کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمھارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکیگا، اور اگر وہ تم کو چھوڑدے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرسکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھین،

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کردی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترکِ عمل کا نہین، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑدیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار رہے تو کوئی ہم کو ناکام نہین کرسکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش اور مددکارآمد نہین ہوسکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام مین خدا پر بھروسہ رکھے،

منافق اسلام اور مسلمانون کے خلاف سازشین اور راتون کو جوڑ توڑ کرتے ہین، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالون کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمھارے کامون کو بنائیگا،

فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا

(نساء - ۱۱)

تو ان منافقون سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھو، اور اللہ ہے کام بنانے والا،

آغاز اسلام کے شروع مین تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت

کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفون کی کثرت، اور دشمنون کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کرکے کام شروع کردو،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔

(شعراء - ۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ دارون کو ہشیار کر اور مومنوں مین سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانین تو کہدے کہ مین تمہارے کامون سے الگ ہون، اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھکو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے، اور نمازیون مین تیری آمد ورفت کو ملاحظہ کرتا ہے

دشمنون کے نرغہ مین ہونے کے باوجود آنحضرت صلعم تنہائی مین راتون کو اٹھ اٹھ کر عبادت گذار مسلمانون کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات مین اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانون کو دی گئی ہے، احزاب مین منافقون اور کافرون کی مخالفانہ کوششون سے بے پروا ہو کر اپنے کام مین لگے رہنے کا جہان حکم دیا گیا ہے وہان اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ	اے پیغمبر خدا سے ڈر، اور کافرون اور
الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۰ اِنَّ اللّٰهَ	منافقون کا کہا نہ مان، بے شک اللہ
كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا، وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى	جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۰ اِنَّ اللّٰهَ	تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف
كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا	سے وحی کیجاتی ہے، اس کے پیچھے چل،
وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	بیشک خدا تمھارے کامون سے خبردار
وَكِيْلًا،	ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، اور اللہ
(احزاب - ۱)	کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیون کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکین تو تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کرلو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہین دھوکا نہ دین خدا پر بھروسہ رکھو تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا،

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اور اگر وہ صلح کے لیے جھکین تو تو بھی
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ	جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک
الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْآ اَنْ	وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور
يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ	اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہین تو کچھ پروا
اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ	نہین کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے
وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ، (انفال - ۸)	تجھکو اپنی اور مسلمانون کی نصرت سے تیری

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے،

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى	بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر
بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ	وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے، جن میں وہ
هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ	مختلف ہیں، اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں
لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ	کے لئے ہدایت اور رحمت ہی بیشک
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ	تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے
بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ	حکم سے فیصلہ کر دے گا، اور وہی
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى	غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا
الْحَقِّ الْمُبِيْنِ، (نمل ۔۷)	پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے، کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ	اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری
نَذِيْرًا، قُلْ مَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ	سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر
مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ	بھیجا ہے، کہدے کہ میں تم سے اسکے
يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔	سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ	مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ

لَا يَمُوتُ، | قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے
(فرقان - ۵) | پر بھروسہ کر جس کو موت نہین،

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروانہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہین،

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ | تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانین، تو (ان سے)
لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ | کہدو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہین کوئی
وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، | معبود، لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ
(توبہ - ۱۶) | کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہی،

آپس کے اختلافات مین اللہ کا فیصلہ چاہئے، اس حالت مین بھی، اسی پر بھروسہ ہے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ | اور جس چیز مین تم مین رائے کا اختلاف
فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ | ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے
رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ | وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر
أُنِيبُ، | مین بھروسہ کرتا ہون، اور اسی کی طرف
(شوریٰ - ۲) | رجوع کرتا ہون،

رسول کو خدا کی آیتین پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دیجاتی ہے کہ اُن کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو،

كَذٰلِكَ أَرْسَلْنٰكَ فِي أُمَّةٍ | ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم مین بھیجا ہے

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا اُمَمٌ	جس سے پہلے بہت سی قومین گذر چکین
لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ	تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو مین نے
اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ	تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے
قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	ماننے سے انکار کرتے ہین، کہدے کہ وہ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ	میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہین
	لیکن وہی، اسی پر مین نے بھروسہ کیا اور
(رعد - ۴)	اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے، اور گمراہون کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد اُن کی شرارتون سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہئے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ	کہدے وہی ہے رحم والا، ہم اُس پر
عَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ	ایمان لائے، اور اسی پر بھروسہ کیا،
مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ،	تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی
(الملک - ۲)	مین ہے،

جس طرح ہمارے رسولؐ کو اور عام مسلمانون کو ہر قسم کی مصیبتون، مخالفتون، اور مشکلون مین خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبرون کو بھی اس قسم کے موقعون پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے، اور خود اولوالعزم رسولون کی زبانون سے عملاً اس تعلیم

کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافرون کے نرغہ مین پھنسے رہے، تو انھون نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنون کو یہ اعلان فرما دیا،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ — (اے پیغمبر!) ان کو نوح کا حال سنا

قَالَ لِقَوْمِهِ يٰقَوْمِ إِنْ كَانَ — جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے

كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي — میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیون

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ — کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق

فَأَجْمِعُوْٓا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ — گذرتا ہے، تو اللہ پر مین نے بھروسہ

ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ — کرلیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے

غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ — شریکون کو خوب مضبوط کرلو، پھر تم

پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اسکو

(یونس - ۸) — مجھ پر پورا کرلو، اور مجھے مہلت نہ دو،

غور کیجیے کہ حضرت نوح نے دشمنون کے ہر قسم کے مکر و فریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ مین استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہین، حضرت ہود علیہ السلام کو اُن کی قوم جب اپنے دیوتاؤن کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب مین فرماتے ہین،

إِنِّيْ أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا — مین اللہ کو گواہ کرتا ہون، اور تم بھی

أَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ — گواہ رہو کہ ان سے بیزار ہون جنکو

دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا	تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر
ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ، اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ	تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو،
عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ،	پھر مجھے مہلت نہ دو، مین نے اللہ پر
	جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے
(هود - ۵)	بھروسہ کرلیا ہے،

حضرت شعیب علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہین کہ مجھے تمہاری مخالفتون کی پروا نہین، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کرونگا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا	مین تو جب تک مجھ مین طاقت ہے
اسْتَطَعْتُ، وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا	کام سدھارنا چاہتا ہون، میری توفیق
بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ	اللہ ہی سے ہے، اسی پر مین نے بھروسہ
اِلَيْهِ اُنِيْبُ، (هود - ۸)	کیا ہے، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہون

ان پیغمبرون کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلعم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کامون کے مشکلات مین اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہئے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	کہدو ان سے جو ایمان نہین لاتے
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ	کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے
اِنَّا عٰمِلُوْنَ، وَانْتَظِرُوْا	ہین، اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو،

اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ، وَلِلّٰہِ غَیْبُ	ہم بھی کرتے ہین، اور اللہ ہی کے قبضہ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْہِ	مین ہے آسمانون کا اور زمین کا چھپا
یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ، فَاعْبُدْہُ	بھید، اور اسی کی طرف سارے کامون
وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ،	کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اُس کی عبادت
(ھود - ۱۰)	کر، اور اس پر بھروسہ کر،

مسلمانون کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے پیرودن کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہوگئے اور خدا کی راہ مین کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی،

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ	تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون
فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ	مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب
اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِہِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا	انھون نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم
مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ	سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو
دُوْنِ اللّٰہِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا	اُن سے بیزار ہین، ہم نے تمھارے مسلک
بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ	کا انکار کر دیا، اور ہم مین اور تم مین
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا	دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لئے کھل
بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰھِیْمَ	گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان
لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ	نہ لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ، رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ	یہ کہنا کہ مین تمہارے لئے خدا سے دعا کرون گا، اور مجھے خدا کے کام مین کوئی اختیار نہین، اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے،
(ممتحنہ ۱)	

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹون کو مصر بھیجتے ہین، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہین کہ یوسف کی طرح اُن کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹون کو کہتے ہین، کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہین، بلکہ متفرق دروازون سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیرون سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لئے بھروسہ تدبیر پر نہین، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے،

وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ وَمَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ	اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازون سے جانا، اور مین تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہین سکتا، فیصلہ اللہ ہی کا ہے، اسی پر مین نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ

الْمُتَوَكِّلُوْنَ، (یوسف - ۸) کرنے والے بھروسہ کرین،

حضرت یعقوب علیہ السّلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکل کے منافی نہین،

حضرت شعیب علیہ السّلام کی دعوت کے جواب مین جب اُن کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بنجانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب مین وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہین،

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا	اگر ہم پھر تمھارے مذہب مین آجائین
اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ	جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم
اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ	نے خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے
لَنَا اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا اِلَّآ اَنْ	نہین ہوسکتا کہ ہم پھر اس مین لوٹکر
يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا	جائین، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ	چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر
تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ	چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ	کیا، اے ہمارے پروردگار ہمارے
الْفٰتِحِيْنَ،	اور ہماری قوم کے بیچ مین تو حق کا
	فیصلہ کردے، اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ
(اعراف - ۱۱)	کرنے والون مین سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی فرمایا،

یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ	اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان
فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ	لا چکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر
مُّسْلِمِیْنَ، (یونس-۹)	تم فرمانبردار ہو،

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا،

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا	ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے
تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ	پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے
(یونس-۹)	آزمائش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور اُن کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ اُن کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے،

مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ	جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اُسکو
حَسْبُهٗ، (طلاق-۱)	کافی ہے،

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے، اور دونوں میں قطعی علٰحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا

نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟ ع

خدا خود میر سامان ست ارباب توکّل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آتیین ہین، وہ ایک ایک کرکے آپکے سامنے ہین، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ اُن مین سے کوئی بھی ان معنون مین ہے، جن مین ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہین، ان مین سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پر زور مخالفون کی تدبیرون سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام مین لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل مین یقین رکھین،

احادیث مین ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلعم کی خدمت مین آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مین اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کرون، (کہ میرا اونٹ مجھکو مل جائے گا) یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو،[1] اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع مین ادا کیا ہے،

ع بر توکّل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہین تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے،

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلھا وتوکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص۳۱۴) مین، اور قیّدہ وتوکل شعب الایمان بیہقی مین اور قیّدھا وتوکل خطیب کی رواۃ مالک، اور ابن عساکر مین ہے، (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۳ حیدرآباد)

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی[1] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہین، اور سمجھتے ہین، کہ مادی اسباب وتدابیر کو چھوڑ کر ان چیزون سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت صلعم نے اُن کے اس خیال کی تردید کردی، اور فرمایا کہ "خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت مین داخل کردیئے جائین گے، یہ وہ ہون گے جو تعویذ گنڈا نہین کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہین، جو داغ نہین کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہین[2]" ایک دوسری حدیث مین ارشاد فرمایا کہ "جو دغوا تا اور تعویذ گنڈا کراتا ہے وہ توکل سے محروم ہے[3]" اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہین، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندون کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہین، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہین[4]" اس حدیث سے بھی مقصود ترکِ عمل اور ترکِ تدبیر نہین، کیونکہ پرندون کو اُن کے گھونسلون مین بیٹھا کر یہ روزی نہین پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتون اور باغون مین جانے اور رزق تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہین وہ

---

[1] شرعی کلمات حقیقت مین اللہ تعالیٰ سے دعائین ہین، اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہی، لیکن آیات اور دعاؤن کا لکھ کر بدن مین لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد مین ان کو لکھنا ثابت نہین [2] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق، و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت مین اکثر بیماریون کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے، [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہین، من اکتوی او استرقی فقد بری من التوکل، [4] جامع ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۳۸۸ و حاکم،

روزی کے لئے دلتنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہین، اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہین، حالانکہ انھین اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا	اور زمین مین کوئی رینگنے والا نہین لیکن اسکی
عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا، (ھود-۱)	روزی خدا کے ذمہ ہے،

تو وہ اُس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ اُن کو دلتنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثون کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت مین ادا ہوا ہے،

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا	اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اسکے لئے مشکل کو
وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ	نکلنے کا راستہ کردیگا، اور اسکو وہان سے روزی
وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ	دیگا جہان سے اسکو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ
إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ	پر بھروسہ کریگا تو وہ اسکو بس ہے، بیشک اللہ
لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا، (طلاق-۱)	اپنے ارادہ کو پہنچکر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کیلئے

[illegible]

اوپر کی تفصیلون سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آجکل کے اخلاقیات مین "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہین جنھین یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہین، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطرون سے محفوظ ہے،

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہین، وہ اُن کے نزدیک بے بسی و بیکسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہین، لیکن کیا واقعہ یہی ہے، ؟

صبر کے لغوی معنی

"صبر" کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہین، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہین بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہین، حضرت موسیٰ اور خضرؑ کے قصہ مین ایک ہی آیت مین تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہین، حضرت خضرؑ کہتے ہین،

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا — تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے، اور

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ، (کہف - ۹)

کیسے اُس بات پر صبر کرسکتے ہو جس کا علم تمھین نہین ،

حضرت موسیٰ جواب مین فرماتے ہین ،

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (کہف - ۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائین گے ،

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت مین غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل مین اضطراب اور بےچینی کا پیدا نہ ہونا ہے ،

کفار اپنے پیغمبرون کے سمجھانے بجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہین، تو اس کی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یون کرتا ہے ،

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ، (فرقان - ۴)

یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤن (بتون) سے ہٹا ہی چکا تھا اگر ہم اُن پر صابر (ثابت) نہ رہتے ،

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے ،

یہی مفہوم ایک اور آیت مین ہے ، کفار آپس مین کہتے ہین ،

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ، (ص - ۱)

کہ چلو اور اپنے خداؤن پر صبر کرو ، (یعنی مضبوطی کیساتھ قائم رہو ،)

عرب گنوار آنحضرت صلعم کے حجرہ کے سامنے اگر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے ،

ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے،

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ	اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے)
اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،	یہانتک کہ تم (اے رسول) نکل کر
(حجرات - ۱)	اُن کے پاس آتے تو ان کیلئے بہتر ہوتا

قرآن پاک مین صبر کا لفظ اسی ایک معنی مین مستعمل ہوا ہے. گو حالات کے تغیر سے اسکے مفہوم مین کہین کہین ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، با این ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جنمین قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہین،

وقت مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت صلعم نے جب شروع مین لوگون کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت مین سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتین اور رکاوٹین پیش کیجانے لگین، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا، کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہین، آپ مستعدی سے اپنے کام مین لگے رہین، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے

فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا ،	فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ
(طور-۲)	تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے ،
فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ	تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو، یہانتک کے
بَیْنَنَا ، (اعراف-۱۱)	خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے ،
وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ وَھُوَ	اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہانتک
خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ ،	کہ خدا فیصلہ کرے ، وہ سب سے فیصلہ
(یونس-۱۱)	کرنے والون مین بہتر ہے ،
فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیْنَ	ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بےشبہہ
(ھود-۴)	آخر کار کامیابی پرہیزگارون ہی کی ہے ،

اس انتظار کی کشمکش کی حالت مین جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بےبسی پاؤن کو ڈگمگا رہی ہو، اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلون کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے ،

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ	ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بیشک
(روم-۶ مومن-۶و۸)	خدا کا وعدہ سچا ہے ،

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور مین اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ مین مل جاؤ ،

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعْ	اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی

مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۔ — سے منتظر رہ ، اور ان (مخالفین مین) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہا نہ مان ۔

(دھر ۔ ۲)

آنحضرت صلعم کو حضرت یونس علیہ السّلام کا قصہ سنایا گیا کہ اُن کو خیال ہوا کہ اُن کی نافرمان قوم پر عذاب آنے مین تاخیر ہو رہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل مین مسلمان ہو چکی تھی، اس لئے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سر رشتہ چھوٹنے نہ پائے ،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۔ — اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر، اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو ،

(ن ۔ ۲)

بے قرار نہونا

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے ، کہ مصیبتون اور مشکلون مین اضطراب اور بیقراری نہ ہو ، بلکہ اُن کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے ، اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا ، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگون کی مدح فرمائی ،

وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ ، (حج ۔ ۵) — اور جو مصیبت مین صبر کرین ،

حضرت یعقوب علیہ السّلام بیٹون سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو کھا لیا ، فرماتے ہین ،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ — بلکہ تمھارے دلون نے ایک بات

اَمْرًا، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ. وَاللّٰهُ	گھڑلی ہے، تو بہتر صبر ہے، اور خدا ہے
الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ	اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان
(یوسف - ۲)	کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سنکر کہتے ہیں،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا	بلکہ تمھارے دلوں نے گھڑ لیا ہے
فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ	تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا اُن
اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا، (یوسف - ۱۰)	سب کو ساتھ لائیگا،

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ	ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا
الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ،	کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع
(ص - ۴)	ہونے والا تھا،

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں،

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ	اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ
سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ	کرگذر، خدا نے چاہا تو مجھے صابروں
الصّٰبِرِيْنَ، (صافات - ۳)	میں سے پائے گا،

مشکلات کو خاطر مین نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے، کہ منزل مقصود کی راہ مین جو مشکلین اور خطرے پیش آئین، دشمن جو تکلیفین پہنچائین، اور مخالفین جو طعن وطنز کرین، ان مین کسی چیز کو خاطر مین نہ لایا جائے، اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والون کی راہ مین یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انھون نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوے، آنحضرت صلعم کو اسی لئے دوسری وحی مین جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا،

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ	اے چادر پوش! اٹھ اور لوگون کو
...... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ	ہشیار کر ...... اور اپنے پروردگار
(مدثر - ۱)	کے لئے پامردی (صبر) کر،

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ	(اے محمد!) تو بھی اسی طرح پامردی
مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ	کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبرون
لَهُمْ .	نے کی، اور ان (مخالفون) کے لئے
(احقاف - ۴)	جلدی نہ کر،

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ مین جو مصیبتین پیش آئین اُنکا مردانہ وار مقابلہ کر،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ	نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور
الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ	جو مصیبت پیش آئے اس کو برداشت
إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان ۲)	کر، یہ بڑی پختہ باتون مین سے ہے،

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بیکسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت صلعم کو اپنے دلدوز طعنون سے تکلیفین پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنون کی پروا نہ کر، اور نہ ان سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنے دھن مین لگا رہ، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبرون نے کیا کیا۔

اِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ	اُن کے کہے پر صبر کر، اور ہمارے بندے
عَبْدَنَا دَاوُدَ، (ص - ۲)	داؤد کو یاد کر،

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے، اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے،

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ	تو اُن کے کہے پر صبر کر، اور صبح شام اپنے
بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ الآية (طٰہٰ ۸ و ق ۳)	پروردگار کی حمد کر،

نہ صرف یہ کہ مخالفون کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب مین اُن سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا،

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ	اُن کے کہے پر صبر کر، اور اُن سے خوبصورتی

هَجۡرًا جَمِيۡلًا۔ (مزمل - ۱) سے الگ ہو جا،

درگذر کرنا

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والون کی برائی کو نظر انداز، اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفین دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے، یعنی تحمل اور برداشت مین اخلاقی پامردی دکھائی جائے، قرآن پاک کی کئی آیتون مین صبر اس مفہوم مین استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا
عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ
خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ، وَاصۡبِرۡ وَمَا
صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحۡزَنۡ
عَلَيۡهِمۡ، وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ
مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ، (نحل - ۱۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تمکو
تکلیف دی گئی، اور البتہ اگر صبر (برداشت)
کرو تو صبر کرنے والون کے لئے یہ بہتر
ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہین
لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ
کر، اور نہ ان کی سازشون سے دلتنگ ہو

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانون کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہی، اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لئے ہو،

وَالَّذِيۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ
رَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ
اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّ

اور جنھون نے اپنے پروردگار کی ذات
کے لئے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی، اور
جو ہم نے ان کو روزی دی اس مین سے

عَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد-۳)

چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت کا (اچھا) انجام ہے،

فرشتے اُن کو مبارکباد دینگے اور کہیں گے،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد-۳)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا،

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا، اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دیگا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جسمیں صبر ہوگا،

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا

بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائیگا، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ،	ہین، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی
(فصلت - ۵)	قسمت والا ہے،

جو لوگون پر ظلم کرتے پھرتے ہین، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہین، ان پر خدا کا عذاب ہوگا، اس لئے ایک صاحبِ عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کرین تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کردے، فرمایا،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ	راستہ ان ہی پر ہے جو لوگون پر ظلم
يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ	کرتے ہین، اور ملک مین ناحق فساد
فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُوْلٰٓئِكَ	کرتے ہین، یہی ہین جن کے لئے پُردرد
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَمَنْ	عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت
صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ	کیا، اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی
عَزْمِ الْاُمُوْرِ، (شوریٰ - ۴)	ہمت کا کام ہے،

ثابت قدمی

صبر کا پانچوان اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت مین میدانِ جنگ مین بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم مین بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگون کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انھون نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا،

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ	اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	دکھانے والے) مصیبت مین اور

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا | نقصان مین اور لڑائی کے وقت،
وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ، (بقرہ-۲۲) | وہی ہین، جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہے،

اگر لڑائی آپڑے تو اس مین کامیابی کی چار شرطین ہین، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت آپس مین اتحاد و موافقت، اور میدانِ جنگ مین بہادرانہ صبر و استقامت،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا لَقِیۡتُمۡ | اے ایمان والو! جب تم کسی دستے
فِئَۃً فَاثۡبُتُوۡا وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ | مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو، اور
کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ، وَ | اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ،
اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا | اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡھَبَ | کرو، اور آپس مین جھگڑو نہین، ورنہ
رِیۡحُکُمۡ وَاصۡبِرُوۡا اِنَّ اللّٰہَ | تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری
مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ، | ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ،
(انفال-۶) | بیشک اللہ صبر کرنے والون کیساتھ ہے،

حق کے مددگارون کی ظاہری قلتِ تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہین کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادرون نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثارون کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنون کی بڑی تھی،

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ | اے پیغمبر! ایمان والون کو دشمنون

عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ	کی) لڑائی پر ابھار، اگر یہ بیس صبر والے
عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا	(ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ	ہون گے، اور اگر سو ہون تو کافرون
مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ	مین سے ہزار پر غالب ہون گے، کیونکہ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ	وہ لوگ سمجھتے نہین، اب اللہ نے تم سے
اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ	تخفیف کر دی، اور اس کو معلوم ہے
وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ	کہ تم مین کمزوری ہے، تو اگر سو صبر والے
يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ	(ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ	ہون گے، اور اگر ہزار (صبر والے)
مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفَيْنِ	ہون تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب
بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ	ہون گے، اور اللہ صبر کرنے والون
الصّٰبِرِيْنَ ۔ (انفال - ۹)	(ثابت قدمون) کے ساتھ ہے،

میدانِ کارزار مین مسلمانون کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کرین، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرین، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگون کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ مین بھی اسی نکتہ کو ان لفظون مین ادا کیا گیا ہے،

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ	طالوت کے ساتھیون نے کہا کہ آج

بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ
اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ
اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ ،

(بقرہ - ۳۳)

ہم مین جالوت اور اُس کی فوج کے مقابلہ
کی طاقت نہین، انھون نے جن کو خیال
تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات
تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے
بڑی تعداد کے لوگون پر غالب آئے
ہین، اور خدا صبر و ثبات دکھانے
والون کے ساتھ ہے، اور جب یہ
جالوت اور انکی فوج کے مقابلہ مین
آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار
ہم پر صبر بہا، اور ہم کو ثابت قدمی بخش
اور ان کافرون کے مقابلہ مین ہم کو

نصرت الٰہی

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانون کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا ہے کہ خدا اُن ہی کا ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہین،

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا
وَصَبَرُوْٓا ، (نحل - ۱۴)

پھر تیرا پروردگار ان کے لئے ہے جنھون نے
ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے
اور صبر و ثبات کیساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت وحکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر واستقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطرافِ ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا،

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا	موسیٰ نے اپنے لوگون سے کہا کہ خدا
بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ	سے مدد چاہو، اور صبر واستقامت
لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ	سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے
عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ	وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندون
	مین سے اس کا مالک بناتا ہے، اور
(اعراف - ۱۵)	انجام پرہیزگارون کے لئے ہے،

چنانچہ بنی اسرائیل مصر وشام وکنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قومون سے تعداد مین بہت کم تھے، لیکن جب انھون نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو اُن کی ساری مشکلین حل ہوگئین، اور کثیر التعداد دشمنون کے نرغہ مین پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قومون پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر مین ظاہر کیا ہے، فرمایا

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ	اور اُن لوگون کو جو کمزور سمجھے جاتے
كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ	تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جس

الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا	ہم نے برکت نازل کی ہے، اور تیرے
فِیْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ	پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ	کے حق مین اُن کے صبر و ثبات کے
بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ	سبب سے پوری ہوئی، اور ہم نے فرعون
یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا	اور اس کی قوم کے کامون کو اور
كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۔ (اعراف ۔ ۱۶)	تعمیرون کو برباد کردیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اسلئے سربلند ہوئی کہ ان نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی،

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً	اور بنی اسرائیل مین سے ہم نے ایسے
یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا	پیشوا بنائے، جو ہمارے حکم سے راہ
وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ،	دکھاتے تھے، جب انھون نے
(سجدہ ۔ ۳)	صبر کیا اور ہمارے حکمون پر یقین

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہین، ایک احکامِ الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری مین صبر اور ثباتِ قدم، یہی دو باتین دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہین، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین، اور پھر اُن اصول کی تعمیل مین ہر قسم کی تکلیفون اور مصیبتون کو خوشی خوشی جھیل لینا،

غزوہ احد مین مسلمانون کو فتح نہین ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک وخون مین لتھڑ کر راہ خدا
مین جانین دیتے ہین، بعض مسلمانون مین اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس
حزن وملال کے ازالہ کے لئے پچھلے پیغمبرون کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے پیغمبر ہین جن کے ساتھ ہو کر
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ، فَمَا وَهَنُوْا	بہت سے خدا کے طالب لڑے ہین
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	پھر خدا کی راہ مین تکلیف اٹھا کر انھون
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا،	نے ہمت نہین ہاری، اور نہ ان کے
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ، وَ	دل بودے ہوئے، اور اللہ ثابت
مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا	رہنے والون (صابرین) کو دوست
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ	رکھتا ہے، اور وہ یہی کہتے رہے کہ
اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ	اے ہمارے پروردگار ہمارے
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى	گناہون کو اور کام مین ہماری زیادتی
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ،	کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت
(آل عمران - ۱۵)	رکھ، اور کافرون کے مقابلہ مین ہماری مدد کر

اس آیت پاک نے غلط فہمیون کے اُن تو بر تو پردون کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی
اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہین، اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور
بیکسی کے مجبورانہ درگذر کا نہین، بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری

اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر مین نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثون کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے، اور اس کو مزید ثباتِ قدم عطا کر کے حق کے دشمنون پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانون کو دو باتون کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے اُن ہی کے حصہ مین ہے جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی، اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی، حق کی راہ مین مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونون الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہین، چنانچہ فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت مین چلے جاؤگے،
وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا	اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ،	الگ نہین کر دیا جو لڑنے والے
(آل عمران - ۱۴۰)	ہین اور جو ثابت قدم (صابر) ہین،

ضبطِ نفس | اشخاص اور قومون کی زندگی مین سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہین، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل

ہوتا ہے، مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے، اور اسی سے اشخاص اور قوموں مین سنجیدگی، متانت، وقار، اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے،

دنیا مین غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہین، ان دونون موقعون پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ مین اس مین فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف مین وہ اُداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونون عیبون کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہی،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ اَذَقْنَاهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔ (ھود - ۲)	اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائین، پھر اس سے اس کو اتارلین تو وہ نا اُمید اور ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائین، تو کہتا ہے کہ برائیان مجھ سے دور ہوگئین، بے شک وہ شادان اور نازان ہے، لیکن وہ جنھون نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے، یہ لوگ ہین جن کے لئے معافی اور بڑا انعام ہے،

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا	ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے بڑھکر ایک ہمنی کروہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی

سے ادا کرنے مین ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے مذہبی فرائض واحکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہین، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال' اور ہر کام مین خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا،

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانون کا پروردگار، اور زمین کا'
وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ	اور جوان دونون کے بیچ مین ہے
لِعِبَادَتِهٖ،	سب کا، تو اس کی بندگی کر، اور اسکی
(مریم - ۴)	بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت مین نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ مین ہے،

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	اور اپنے گھر والون کو نماز کا حکم کر اور
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، (طٰہٰ - ۸)	آپ اس پر قائم رہ،

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے،

حسب ذیل آیتون مین غالباً صبر اسی مفہوم مین ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سناتا ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ	تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے

وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا	بچا لیا اور اُن کو ترو تازگی وشادمانی
وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً	سے ملایا، اور اُن کے صبر کرنے (دینی
وَّحَرِيْرًا،	احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے
(دھر-۱)	سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ مین دیا

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ مین توبہ کرین، ایمان لائین، نیک کام کرین، فریب کے کامون مین شریک نہ ہون، بیہودہ اور لغو کامون کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائین، اور خدا کی باتون کو سنکر اطاعت مندی سے اس کو قبول کرین اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائین مانگین، اُن کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ	ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ مین ملیگا
بِمَا صَبَرُوْا، (فرقان-۶)	کہ وہ صبر کرتے رہے،

ان دونون آیتون مین صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کامون کو بارِ خاطر، خلافِ طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے، اور بری باتون سے باوجود اس کے کہ ان مین ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتون کو نرم بسترون سے اُٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہوکر دوگانہ ادا کرنا، الوان نعمت کی لذتون سے محروم ہوکر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعون پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ مین شدائد کو آرام و راحت جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے

احکام کی بجاآوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لئے ایسے صابرون کی جزا بھی خدا کے ہان بھاری ہے،

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح مین وہ حدیث یاد آتی ہے جسمین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

حجبت (حُفّتِ) الجنّۃ بالمکارہ	جنت ناخوشی کے کامون، اور دوزخ
وحجبت (حفّتِ) النّارُ بالشہوات	نفسانی لذتون کے کامون سے ڈھانپی
(صحیح بخاری کتاب الرقاق وصحیح مسلم) کتاب الجنۃ	گئی ہے،

یعنی نیکی کے ان کامون کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا مین نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہون کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا مین بڑے پر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہین، اس عارضی وہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منھ مین پانی نہ بھر آئے، اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابرون کو ملی ہے،

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ مین جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ مین پڑ گئے، لیکن جنہین صبر و برداشت کا جوہر تھا اُن کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور اُن کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نکوکارون کو بہشت مین ملیگی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے،

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ، وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ،

(قصص - ۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کے خواہان تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے، اور جنھین علم ملا تھا، انھون نے کہا، تمھارا برا ہے، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، سب سے اچھی چیز ہے، اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہین جو صابر ہین۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملیگی جو لازوال اور باقی ہے،

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(نحل - ۱۳)

جو تمھارے پاس ہو وہ چک جائیگا، اور جو خدا کے پاس ہو وہ رہجانے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنھون نے صبر کیا انکی مزدوری اُن کے بہتر کامون پر دینگے،

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازین ادا کیا کرو، کہ نیکیان بدیون کو دھو دیتی ہین، اس پیغام مین نصیحت قبول کرنے والون کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، اس کے بعد ہے،

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

اور صبر کر کہ بے شبہہ اللہ نیک کام

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ، (ھود - ۱۰) — کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا،

صبر کے فضائل اور انعامات | یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی،

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ — صبر کرنے والوں کو تو اُن کی مزدوری

بِغَيْرِ حِسَابٍ ، (زمر - ۲) — بے حساب ملیگی،

جن محاسن اور محامد صفات، اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے اُن میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے،

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ — بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں

وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ — اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور

وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ — بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے

الصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ — والی عورتیں، اور محنت سہنے والے مرد

وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ — (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں

الْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ — (صابرات)، اور (خدا کے سامنے) جھکنے

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ — والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور

وَالصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ — خیرات کرنے والے مرد اور خیرات

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ — کرنے والی عورتیں، اور روزہ دار

الْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ — مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی

كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ — شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے

لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا،

(احزاب - ۵)

مرد اور حفاظت کرنے والی عورتین، اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتین، اللہ نے اُن کیلیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیون کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیان حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہین، اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُس کے معاوضہ مین ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت مین بھی ہے،

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ،

(آل عمران - ۲)

(جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لاچکے، ہمارے گناہون کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ مین) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتون کو خدا سے اپنے گناہون کی معافی مانگنے والے،

اس آیت مین ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اوران دونون کے بیچ مین اُن کے چار اوصاف گنائے ہین، جن مین پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے، اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی وعبودیت کا، اور چوتھا راہِ خدا مین خرچ کرنے کا،

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا

بعض آیتون مین ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظون مین سمیٹ لیا گیا ہی دعا، اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزین مشکلات کے طلسم کی کنجی ہین،

یہود جو آنحضرت صلعم کے پیغام کو قبول نہین کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلون مین گداز اور تاثر نہین رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ اُن کو جو جانی ومالی دشواریان پیش آتین، یہ عیش وعشرت اور ناز ونعمت کے خوگر ہو کر، اُن کو برداشت نہین کرسکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلعم کی طبِ روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ - ۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو،

دعا سے اُن کے دل مین اثر، اور طبیعت مین گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلین دور ہون گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانون کے برخلاف تلوار اٹھائین، اور مسلمانون کے ایمان کے لئے اخلاص کی ترازو مین تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتین نازل ہوئین

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بیشک اللہ

مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ
لَّا تَشْعُرُوْنَ، وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ
بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ
نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ
الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ
قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ
اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ
رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ
ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ، (بقرہ-۱۹)

صبر والون (ثابت قدم رہنے والون)
کے ساتھ ہے، اور جو خدا کی راہ مین مارے
جاتے ہین، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ
ہین لیکن تم کو خبر نہین، اور ہم تم کو کسی
قدر خطرہ، اور بھوک اور مال و جان
اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائینگے
اور صبر والون (یعنی ثابت قدم رہنے
والون) کو خوشخبری سنا دو، جن کو جب
کوئی مصیبت پیش آئے تو کہین کہ ہم
اللہ کے ہین، اور ہم کو اللہ ہی کے پاس
لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہین، ان پر
ان کے پروردگار کی شاباشین اور
مہربانیان ہین، اور یہی ہین ہدایت یاب ہین

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانون کو کیونکر زندہ رہنا چاہئے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اسکو صبر، ضبطِ نفس، اور ثابت قدمی سے برداشت کرین اور یہ سمجھین کہ ہم خدا کے محکوم ہین، آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی، اس لئے حق کی راہ مین مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے، اگر اس راہ مین موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے،

شکر

وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (اعراف - ١٧)

لغت مین شکر کے اصلی معنی یہ ہین کہ "جانور مین تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے" اس سے انسانون کے محاورہ مین یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقون سے ہوسکتی ہے دل سے زبان سے اور ہاتھ پاؤن سے یعنی دل مین اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اسکے کامون کا اقرار ہو، اور ہاتھ پانون سے اُس کے ان کامون کے جواب مین ایسے افعال صادر ہون جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کرین،

شکر کی نسبت جس طرح بندون کی طرف کیجاتی ہے، خدا نے قرآنِ پاک مین اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ذرا ذرا سے کامون کی پوری قدر کرتا ہے، اور اُن کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے،

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہین، اور محاورہ مین کسی کے کام یا احسان

پر پردہ ڈالتے اور زبان و دل سے اس کے اقرار، اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں اسی سے ہماری زبان میں "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال میں ہے،

یہی کفر وہ لفظ ہے، جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآنِ پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں،

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا	ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ)
شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا، (دھر-۱)	یا شکر گذار (شاکر) ہو، یا ناشکرا (کافر)
لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ	اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمھیں بڑھائیں گے
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ	اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بیشک میرا
لَشَدِيْدٌ، (ابراھیم-۲)	عذاب بہت سخت ہے،

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کیجائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً	در اصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا
قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ	اور اللہ کا فرمانبردار، اس کو ایک ماننے
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ	والا تھا اور شرک کرنے والون مین
اجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ	سے نہ تھا، اللہ کے احسانون اور نعمتون
مُّسْتَقِيْمٍ ،	کا شکرگذار، اللہ نے اس کو چن لیا، اور
(نحل - ۱۶)	اس کو سیدھی راہ دکھائی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتون اور احسانون کی شکرگذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کیجائے، احکام الٰہی کی پیروی کیجائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل مین ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا،

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے، جس کی بنا پر بندہ کے دل مین اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ	اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ	عذاب دے کر کیا کرے گا، اور اللہ تو
شَاكِرًا عَلِيْمًا ، (نساء - ۲۱)	قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہی،

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندون سے صرف دو باتین چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت مین جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ مین داخل ہی، ساری عبادتین

شکر ہین، بندون کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولتمند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ مین دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحبِ علم اپنے علم سے بندگانِ الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور، کمزورون کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت وطاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتین اسی ایک شکر کی تفصیلین ہین اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکمون سے نافرمان ہو نگے تو یہ کہا،

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔ (اعراف-۲) — اور تو ان مین سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا،

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندون کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِيْنَ، (آل عمران) — اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دینگے،

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظون مین دیتا ہے،

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ، وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ، (زمر-۷) — بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گذارون مین سے ہو،

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہین، کبھی اپنے ہاتھ پاؤن سے پورا کرتے ہین، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہین، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح مین حمد ہے، جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہی سبب ہے کہ حمدِ الٰہی مین اللہ تعالیٰ کے ان صفاتِ کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانون

اور نعمتون کی پہلی اور اصلی محرک ہین، اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآنِ پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے، اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، (فاتحہ-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے

جہان اور جہان مین جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہین، سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا، اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہین، اور نکھر رہے ہین، اس لئے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگِ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کرکے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کرکے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت مین ظاہر ہو چکین گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا مین اپنی زندگی پا چکے گا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکین گے اور اہلِ جنت جنت مین اور اہلِ دوزخ دوزخ مین جا چکین گے، وہ وہ وقت ہوگا، جب دنیا اپنے اُس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سرمدی آواز بلند ہوگی،

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، (زمر-۸) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے،

لَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (روم-۲) اسی کی حمد آسمانون مین ہے اور زمین مین ہے،

فرشتے بھی اسی حمد مین مشغول ہین،

الَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ	جو عرش کو اٹھائے ہین، اور جو اس کے
مَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ	چارون طرف ہین وہ اپنے پروردگار
رَبِّہِمْ، (مومن - ۱)	کے حمد کی تسبیح کرتے ہین،

بلکہ عرصۂ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح مین لگی ہوئی ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ	اور کوئی چیز نہین جو اس (خدا) کی حمد کی
(بنی اسرائیل - ۵)	تسبیح نہ کرتی ہو،

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانون سے ہے،

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ، (حجر، طٰہٰ، مومن، طور، فرقان)	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کے سنن اور شمائل مین ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائین ہین مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد مین جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتون کی حمد اور زبان سے اُس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتین عنایت فرمائی ہین، اُن کا شکریہ یہ ہے، کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤن کو خدا کے حکمون کی تعمیل مین لگا رکھین، اور اُن سے اُن کی خدمت کرین جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزء سے محروم ہین، مثلاً جو اپاہج اور معذور ہون، بیمار ہون، کسی جسمانی قوت سے

محروم ہون، یا کسی عضو سے بیکار ہون، مالی نعمتون کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہون، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکون کو کھانا کھلایا جائے، پیاسون کو پانی پلایا جائے، ننگون کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایون کو سرمایہ دیا جائے،

قرآنِ پاک کی مختلف آیتون مین مختلف نعمتون کے ذکر کے بعد شکرِ الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت مین اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ	بڑی برکت اسکی ہے جس نے آسمان مین
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا	برج بنائے، اور اس مین ایک چراغ
وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا، وَهُوَ الَّذِیْ	اور اجالا کرنے والا چاند رکھا، اور اسی
جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً	نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ	آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا
شُكُوْرًا، (فرقان - ۶)	یا شکر کرنا چاہے،

اس مین اپنی قدرت کی نعمتون کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کرین، اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون مین ہم وہ فرض ادا کرین، جس کے لئے یہ چیزین ہم کو بنا کر دی گئی ہین، دوسری آیتون مین ہے،

..... الرَّحِیْمُ الَّذِیْۤ اَحْسَنَ	بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز
كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ	بنائی، اور انسان کی پیدایش ایک گارے

الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، ثُمَّ	سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر
جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ	سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر
مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ	اس کو درست کیا، اور اس مین اپنی
وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ	روح سے کچھ پھونکا، اور تمھارے
لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	کان، اور آنکھین اور دل بنا دیئے
وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سجدہ ۱)	تم کم شکر کرتے ہو،
وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ	اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤن کے
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا	پیٹون سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ
وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	تھے، اور تمھارے لئے کان اور
وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (نحل ۱۱)	آنکھین اور دل بنائے،

ان آیتون مین خلقتِ جسمانی کی نعمت کا بیان، اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت وکبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں، اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی، اور اس زندگی مین ہم کو یون بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس مین بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر ہاتھ پاؤن سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کرین، بعض اور آیتون مین ہے،

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ	تو ان جانورون کے گوشت مین سے

وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (حج-۵)	کچھ آپ کھاؤ، اور کچھ اُن کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہو، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو مین دیے ہین، تاکہ تم شکر کرو،
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ، (بقرہ-۲۱)	اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزون مین سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو،
فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ، (نحل-۱۵)	تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزین روزی کین اُن کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اُسی کو پوجتے ہو،

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کرین،

دنیا مین شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کرین، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہین کیا جا سکتا، اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندون کے ساتھ کرین، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظون مین ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ	اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی

اِلَیۡکَ، (قصص - ۸)　　　　کی تو بھی بھلائی کر،

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہین، کہ اس کو کوئی قرضہ دے خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورتمند بندون کو یا قابلِ ضرورت کامون مین روپیہ دیا جائے ارشاد ہوتا ہے،

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (بقرہ ۳۲ - وحدید ۲)　　　　کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے،

وَاَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (قد ۲ و مزمل ۲)　　　　اور خدا کو قرض حسنہ دو،

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا، (تغابن ۲)　　　　اگر خدا کو قرض حسنہ دوگے،

خدا کو قرضِ حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی مین اس حدیث کو پڑھنا چاہیے،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا' اے آدم کے بیٹے! مین بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار، تو تو جہان کا پروردگار ہے مین تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائیگا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائیگا اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہین کھلایا، بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا رب ہے، مین تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلان بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہین کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اسکا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہین

پلایا، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، مین تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا، میرے فلان بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تونے اس کو نہین پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔ لے

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتون کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے،

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتون کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگین کہ خدا کے فضل وکرم کے سوا ہم ان نعمتون کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی، جو کچھ ملا اس کے فضل وکرم سے ملا، اور جو کچھ ملیگا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششون کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین، دیکھ کر، اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہین، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہین، مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلین نکلتی ہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک مین اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیتِ الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بارآور بنائے،

دولت ونعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانون سے کوئی بلند تر ذات ہے، اور جو اُس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا، یا اس کے یہ ذاتی علم وہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے

لے صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا،

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ، (حدید-۳)

(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا، جو خود کنجوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں، اور جو (اللہ کی بات سے) منھ موڑے گا، (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے،

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے، کہ وہ تو غنی ہے، اور نہ اُن کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے،

خدا نے انسانوں پر جو تو بر تو نعمتیں اتاری ہیں، اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے، اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے،

وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ، (انفال-۳)

اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دین تاکہ تم شکر کرو،

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا
مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى
الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا
مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔

(نحل - ۲)

اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں
کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی)
کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو
جس کو تم پہنتے ہو، (یعنی موتی) اور تم
جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی
کو پھاڑتے رہتے ہیں، اور تا کہ تم خدا
کی مہربانی ڈھونڈو اور تا کہ شکر کرو،

كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ، (حج - ۵)

اسی طرح ہم نے ان جانوروں
کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو،

وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ
اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ۔

(قصص - ۷)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس
نے تمہارے لئے رات اور دن بنایا
کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو)
اس کے فضل و کرم کی تلاش کرو اور
تا کہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ	اللہ نے انسانون پر بڑے بڑے فضل
وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ	کئے، لیکن ان مین سے بہت کم شکر
(یونس-۲)	کرتے ہین،
وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَ	اور ہم نے تم کو زمین مین قوت بخشی،
جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ	اور اس مین تمھارے لئے بسراوقات
قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ	کے بہت سے ذریعے بنائے، تم
(اعراف-۱)	بہت کم شکر کرتے ہو،

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا،

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ، (عبس-۱) مارے جائیو، انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے"

شکر کے باب مین ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہین کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا، تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالانکہ یہ صحیح نہین ہے شکر در اصل دل کے اُس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہین، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہین، اور اُس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہین، اور کوشش کرتے ہین کہ ہم اس کو خوش رکھ سکین، اور اس کی فرمایشون کو پورا کرتے رہین، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرین، لیکن دل مین احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو، اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار مین جھوٹے ہین، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ مین قبول نہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام کو اپنے پے درپے احسانات

سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کر کے فرماتا ہے،

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ، (سبا-۲)

اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے کے لئے نیک عمل کرو،

اس آیتِ پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہین،

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ ، (نمل-۲)

اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر مین تیرے اُس احسان کا جو تونے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کرون اور وہ نیک کام کرون جو تجھے پسند ہو،

اس دعا مین بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر مین، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو،

دل مین یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندون کے حق مین جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائین گے مین اُن کے لئے اپنی نعمتون کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤنگا اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل مین سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب مین اس کو نئی نئی نعمتین اور عنایت ہوتی جاتی ہین، اسی لئے فرمایا،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ	اگر تم شکر ادا کروگے تو مین تم کو اور بڑھاؤنگا،
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم ۲)	اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے،
كَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ شَكَرَ (قمر ۲)	ہم اسی طرح اسکو جزا دیتے ہین جس نے شکر کیا،
وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ۔ (آل عمران ۱۵)	اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دینگے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل مین ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا مین بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتون کی قدر جانگر اس کو مانیگا اور اس کے حکمون پر چلے گا اور اس کے بندون کے ساتھ شکرانہ مین بھلائی کرے گا، اور خود بندون کے احسانات کے جواب مین بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا، بلکہ آنحضرت صلعم نے خود آپس مین ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَنْ لَّا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ، (ترمذی کتاب البر والصلۃ) یعنی جو انسانون کا شکر ادا نہ کرے گا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا، اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانون کے احسانون کا شکریہ ادا نہ کرے گا، تو خدا بھی اپنے احسانون کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا،

خاتمہ

کتاب کی پانچوین جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات مین آنحضرت صلعم کی اُن تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب مین آپنے فرمائی ہین، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انھون نے وہم پرستیون اور غلط فہمیون کے کتنے تو بر تو پردے چاک کردیے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزر ہے، اس کی حقیقت کتنی واضح کردی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالی نے آپ کو سکھائے، اور آپنے وہ انسانون کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان مین کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل، اور دین و دنیا کی مصلحتون اور فائدون پر مشتمل ہی اور آپنے اُن کے ذریعہ انسانی دلون کی کمزوریون اور روح کی تمام بیماریون کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلعم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہین ہے، اور ان ہی مین سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس مین عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح اور متعین ہے، اور زمانہ مابعد مین انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیون سے مبرا ہے، اور اس کا اس طرح ہونا اس لئے ضروری تھا کہ اس پر

نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اس لئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا اُن پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا،

صَلَوَاتُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَبَرَکَاتُہٗ،

مغفرت کا طلبگار

سید سلیمان ندوی

۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ

سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبیؐ کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دارالمصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہی کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمعِ ہدایت کی روشنی مین چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدون کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں جب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ معہ عـــہ ر ہوتا ہی، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف عـــہ ر میں یہ دس جلدیں کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دارالمصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول،	خلفائے راشدینؓ	ے ر	جلد ششم،	سیر الصحابہؓ ششم،	عہ ر
جلد دوم،	مہاجرینؓ اول،	ہے ر	جلد ہفتم،	سیر الصحابہ ہفتم،	عہ ر
جلد سوم،	مہاجرینؓ دوم،	ے ر	جلد ہشتم،	سیر الصحابیاتؓ،	عہ ر
جلد چہارم،	سیر الانصارؓ، اول	ے ر	جلد نہم،	اسوۂ صحابہؓ اول،	عہ ر
جلد پنجم،	سیر الانصارؓ، دوم	عہ ر	جلد دہم،	اسوۂ صحابہ دوم،	ہے ر

منیجر:- دارالمصنفین، اعظم گڈھ،